تاریخِ حدیث

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محترم وائس چانسلر صاحب محترم اساتذہ کرام ! برادران و ہمشیر گان !

السلام علیکم و رحمۃاللہ و برکاتہ !

جیسا کہ ابھی اعلان کیا گیا آج کی تقریر کا موضوع تاریخ حدیث ہے۔ قرآن مجید کے بعد حدیث کا ذکر ناگزیر ہے، اس لیے کہ یہی دو چیزیں ہیں جو اسلام کا محور ہیں۔ شاید یہ نامناسب نہ ہوگا اگر میں شروع ہی میں تاریخ کے اس پہلو پر نظر ڈالوں کہ حدیث کی اہمیت کیا ہے اور یہ کہ حدیث اور قرآن کا ایک دوسرے کے ساتھ کس قسم کا تعلق ہے؟ ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں اور کچھ نہیں تو دس پندرہ جگہ صراحت کے ساتھ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی بات مانو مثلاً "ما آتاکم الرسول فخذوہ ومانھکم عنہ فانتھوا" (جو تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم دے دیں اسے لے لو اور جس سے وہ تمہیں منع کریں اس سے رک جاؤ۔ 7:59) اس سے بھی زیادہ زوردار صراحت کے ساتھ ایک اور آیت ہے: "من یطع الرسول فقد اطاع اللہ" (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی اطاعت کرتا ہے وہ گویا خدا کی اطاعت کرتا ہے۔ 80:4) تو یہ آیت نیز اس طرح کی دوسری آیتیں ہمیں بتاتی ہیں کہ قرآنی تصور میں حدیث کوئی کم

درجے کی چیز نہیں بلکہ ایک لحاظ سے اس کا درجہ قرآن کے برابر ہی ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک سفیر کسی بادشاہ کی طرف سے دوسرے بادشاہ کے پاس ایک خط لے کر جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خط میں زیادہ تفصیلیں نہیں ہوں گی لیکن جس مسئلے کے لیے سفیر بھیجا جاتا ہے اس مسئلے پر جب گفتگو ہو گی تو سفیر کا بیان کیا ہوا ہر ہر لفظ بھیجنے والے بادشاہ ہی کا پیغام سمجھا جائے گا۔ اس مثال کے بیان کرنے سے میرا منشاء یہ ہے کہ حقیقت میں حدیث اور قرآن ایک ہی چیز ہیں دونوں کا درجہ بالکل مساوی ہے۔ ایک مثال سے میرا مفہوم آپ پر زیادہ واضح ہو گا۔ فرض کیجئے کہ آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہوں اور ہم میں سے کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کرنے کا اعلان کرے اور اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر یہ جاہل شخص اگر کہے کہ یہ تو قرآن ہے خدا کا کلام، میں اسے مانتا ہوں مگر یہ آپ کا کلام ہے اور حدیث ہے یہ میرے لیے واجب التعمیل نہیں ہے، تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ فوراً ہی اس شخص کو امت سے خارج قرار دے دیا جائے گا اور غالباً اگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں پر موجود ہوں تو اپنی تلوار کھینچ کر کہیں گے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجازت دیجئے کہ میں اس کافر و مرتد کا سر قلم کر دوں۔ غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں یہ کہنا کہ یہ آپ کی نجی بات ہے اور مجھ پر واجب العمل نہیں ہے گویا ایک ایسا جملہ ہے جو اسلام سے منحرف ہونے کا مترادف سمجھا جائے گا۔ اس لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بھی ہمیں حکم دیں اس کی حیثیت بالکل وہی ہے جو اللہ کے حکم کی ہے۔ فرق دونوں میں جو کچھ ہے وہ اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ قرآن مجید کی تدوین اور قرآن مجید کا تحفظ ایک طرح سے عمل میں آیا ہے اور حدیث کی تدوین اور حدیث کا تحفظ دوسری طرح سے۔ اس لیے تحقیق اور ثبوت کا مسئلہ

پیدا ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں تو ثبوت کا کوئی سوال نہیں تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو بھی ارشاد ہوا وہ یقینی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا۔ لیکن بعد کے زمانے میں یہ بات نہیں رہتی۔ میں ایک حدیث سن کر آپ سے بیان کرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو بالکل سچے ہیں لیکن میں جھوٹا ہو سکتا ہوں۔ مجھ میں انسانی کمزوری کی وجہ سے خامیاں ہوں گی۔ ممکن ہے میرا حافظہ مجھے دھوکہ دے رہا ہو۔ ممکن ہے مجھے غلط فہمی ہوئی ہو۔ ممکن ہے میں نے غلط سنا ہو۔ کسی وجہ سے مثلاً دھیان کم ہو جانے کی وجہ سے یا کوئی چیز حرکت میں تھی اس کے شور کی وجہ سے میں نے کوئی لفظ نہیں سنا تو خلط مبحث پیدا ہو گیا۔ غرض مختلف وجوہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حدیث یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا دوسروں تک ابلاغ اتنا یقینی نہیں رہتا جتنا قرآن کا یقینی ہے۔ قرآن مجید کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی میں مدون کرایا اور اس کے تحفظ کے لیے وہ تدبیریں اختیار کیں جو اس سے پہلے کسی پیغمبر نے نہیں کی تھیں یا کم از کم تاریخ میں ہمیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مگر حدیث کے متعلق یہ صورت پیش نہیں آئی اور اس کی وجہ ممکن ہے رسول للہ صلی اللہ علیہ و سلم کے خصائل مبارکہ کا یہ پہلو بھی ہو کہ آپ میں تواضع بہت تھی۔ اپنے آپ کو محض انسان سمجھتے تھے۔ (انما انا بشر مثلکم) یہ خیال آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر زیادہ غالب رہتا تھا، بہ نسبت اس خیال کے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ شاید یہ تصور رہا یا کوئی اور، بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کی تدوین پر وہ توجہ نہ فرمائی جو قرآن مجید کے متعلق رہی۔ اس کی وجہ ایک اور بھی ہے جو بہت اہم ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں (وما ینطق عن الھوی۔ ان ھوا الاوحی یوحی 4,3:53) کے ذریعے سے یہ واضح کیا

گیا کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم سے بیان کرتے ہیں وہ اپنی خواہش سے نہیں کرتے بلکہ وہ اللہ کی وحی کردہ چیز ہوتی ہے۔اس طرح ہمیں یقین دلایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بھی بیان کرتے ہیں وہ خدا کی وحی پر مبنی ہوتا ہے۔جب وحی آتی آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں غلطی نہیں کرتے اسے من وعن پہنچاتے ہیں لیکن اگر وحی نہ آئے تو انتظار کرتے ہیں۔کیونکہ وحی پیغمبر کے اختیار میں نہیں۔ جب خدا چاہتا ہے وحی کرتا ہے اور جب نہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سوائے انتظار کے کوئی چارہ نہیں ہوتا اور وہ اپنی طرف سے کچھ کہہ کر من گھڑت طور سے اپنی بات کو وحی قرار نہیں دے سکتے۔ ہمیں حدیث میں ایسی کافی مثالیں ملتی ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بعض دنیوی معاملات میں آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشورہ بھی فرماتے تھے۔مثال کے طور پر ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ احکام دیے۔ صحابہ نے کہا کہ کیا یہ وحی پر مشتمل ہیں۔آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ اگو وحی پر مشتمل ہوتے تو میں تم سے مشورہ نہ کرتا۔ایک دوسری حدیث بہت دلچسپ ہے جو کھجور کے درختوں کے متعلق ہے۔آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے اور وہاں دیکھا کہ نر درختوں کے پھول مادہ پھول کے اندر ڈالے جاتے ہیں گویا اس عمل کی وجہ سے کھجور پیدا ہوتی ہے۔آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت میں جو حیا تھی اس کی بناء پر آپ کو یہ عمل پسند نہیں آیا اور کہا کہ نر اور مادہ کا تعلق پیدا کرنا درختوں میں مناسب نہیں ہے، بہتر ہے کہ تم یہ نہ کرو۔ لوگوں نے جب اس حکم پر عمل کیا تو کھجور کی پیداوار اس سال بہت خراب گئی۔سب لوگ آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے اس سال بیج ڈالنے (Pollination) کا عمل نہیں کیا جس کی وجہ

سے کھجور کی پیداوار نہیں ہوئی اس پر (ترمذی شریف وغیرہ کی حدیثوں کے مطابق) آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب یہ تھا "انتم اعلم بامور ادنیا کم" (تم اپنے دنیاوی معاملات کو میرے مقابلے میں بہتر جانتے ہو) اس مثال سے یہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی چیز وحی کے تحت بیان کریں تو اس کی حیثیت قرآن کے مطابق ہوگی۔ لیکن کوئی بات اپنی طرف سے بیان کریں تو وہ ایک ذہین، ایک فہیم انسان کا بیان ہوگا لیکن خدائی وحی نہیں ہوگی، انسانی چیز ہوگی اور انسانی چیز میں خامیاں ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ حدیثوں میں اس کا ذکر آتا ہے کہ کبھی کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے چار رکعت کے تین ہی رکعت کے بعد سلام پھیر لیا، یا یہ کہ بجائے دو کے تین رکعتیں پڑھ لیں، سہو ہو گیا تو یہ انسانی بھول چوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ممکن ہے اور ایسا مصلحت الٰہی کے تحت واقع ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے اسوہ حسنہ قرار دیا ہے۔ کوئی رسول اسوہ حسنہ اور کامل نمونہ اس وقت ہو سکتا ہے جب وہ انسانی دائرے میں رہے۔ یعنی وہ ایسا ہی کام کرے جسے اور انسان بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے بر خلاف اگر رسول "فوق البشر" بن جائے تو ہمارے لیے اسوہ حسنہ نہیں رہے گا۔ اس لیے ایسی مثالیں پیش آتی ہیں کہ فجر کی نماز کا وقت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سو رہے ہیں، بیدار نہیں ہوتے جب سورج طلوع ہوتا ہے تو سورج کی کرنوں کی گرمی اور جلن سے بیدار ہوتے ہیں یا جیسا کہ میں نے بیان کیا، کبھی نماز پڑھنے میں رکعتوں کی تعداد میں سہو فرماتے ہیں، یا اسی طرح کی چیزیں پیش آتی ہیں جن کا حکمت الٰہی کے تحت منشاء اور غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ ہمیں یقین دلایا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی انسان ہی ہیں۔ وہ جو کام کرتے رہے اس کے متعلق کبھی یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ ہم نہیں کر سکتے بلکہ ہم بھی چاہیں تو کر

سکتے ہیں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں یاد رہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کا ہمیشہ طرز عمل یہ رہا کہ ایسے کام نہ کریں جو امت کی طاقت سے بالاتر اور ان کی استطاعت سے باہر ہوں۔ مثال کے طور پر "وصال" نامی روزے کا میں آپ سے ذکر کروں گا۔ "وصال" کے معنی یہ ہیں کہ چوبیس گھنٹے کی جگہ اڑتالیس گھنٹے کا روزہ رکھا جائے۔ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم شدت سے منع فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ چوبیس گھنٹے کا بھی روزہ نہ رکھو بلکہ سحری کرو، اور اس پر بہت زور دیتے تھے۔ ایک مرتبہ صحابہ نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم آپ تو ہمیں حکم دیتے ہیں یوں کرو مگر خود آپ کا طرز عمل اس کے برخلاف ہے۔ ہم بھی ویسا ہی کرنا چاہتے ہیں، تو حدیث میں ایک دلچسپ ذکر آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے کہا اچھا کوشش کر کے دیکھو۔ آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے چوبیس گھنٹے روزہ رکھا، افطار نہیں کیا اسے اور بڑھایا اور اڑتالیس گھنٹے گزرے، اب لوگوں کو شدید پریشانی ہوئی۔ حسن اتفاق سے شوال کا چاند 29 تاریخ کو نظر نہ آتا تو رسول صلی اللہ علیہ و سلم شاید 72 گھنٹے کا روزہ رکھتے پھر ان لوگوں کو پتہ چلتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی تقلید کرنے کی جو تم خواہش رکھتے ہو وہ تمہارے لیے مناسب نہیں ہے۔ امت کے لیے مصلحت یہی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے حکم پر عمل کریں، یہ نہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ و سلم کی تقلید میں وہ کام کرنا چاہیں جو ان کے بس کی چیز نہیں۔ ممکن ہے کوئی ایک شخص ایسا کر سکے لیکن عوام الناس ضعیف اور کمزور لوگ ہوتے ہیں وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ غرض حدیث کی اہمیت قرآن کی اہمیت سے کسی طرح کم نہیں۔ اگر ان دونوں میں فرق ہے تو اس قدر کہ حدیث کا ثبوت ہمیں اس طرح کا نہیں ملتا جس طرح قرآن کے متعلق ملتا ہے کہ متواتر چودہ سو سال سے اس کے ایک

ایک لفظ، ایک ایک نقطے اور ایک ایک شوشے کے متعلق ہمیں کامل یقین ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے زمانے کا جو قرآن تھا وہی اب بھی باقی ہے۔ حدیث کے متعلق ایسا نہیں ہوا۔

اس تمہید کے بعد میں آپ سے یہ عرض کروں گا کہ قرآن کی مماثل چیزیں اور قوموں میں بھی ملتی ہیں، مثلاً یہودیوں کے ہاں توریت اللہ کی نازل کردہ کتاب ہے یا مثلاً اور قوموں کی طرف خدا کی بھیجی ہوئی کتابیں ہیں، تو قرآن کے مماثل الہامی کتابوں کی مثالیں ہمیں ملتی ہیں، لیکن حدیث کی مماثل چیزیں دیگر قوموں میں مجھے نظر نہیں آتیں۔ بدھ مت میں ایسی چیز موجود ہے مگر اس کی اہمیت وہ نہیں ہے جو ہمارے ہاں حدیث کی ہے۔ بدھ مت کی اساسی اور بنیادی کتاب اسی قسم کی ہے جیسے ہمارے ہاں ملفوظات کے نام سے مشہور مجموعے ہیں جن میں کسی ولی، کسی بزرگ یا کسی مرشد کے اقوال کو ان کے مریدوں میں سے کسی نے قلم بند کیا ہے۔ گوتم بدھ کے ملفوظات بھی صرف ایک شخص کے جمع کردہ ہیں لیکن حدیث کے مماثل کوئی ایسی چیز نہیں ملتی کہ بہت سے اہل ایمان اپنے مشاہدات اور اپنے محسوسات کو جمع کر کے بعد والوں تک پہنچانے کی کوشش کریں، جیسا کہ حدیث کے مجموعوں میں کوشش کی گئی ہے۔ یہ بات دوسروں کے ہاں مفقود ہے۔ گویا حدیث ایک ایسا علم ہے اور حدیث کے مندرجات ایسی چیزیں ہیں جن کے مماثل کوئی اور چیز دوسرے مذاہب میں ہمیں نظر نہیں آتی ان حالات میں تقابلی مطالعے کا امکان باقی نہیں رہتا لہٰذا براہ راست رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی تاریخ ہی پر اکتفا کرنا پڑے گا۔

حدیث کے سلسلے میں اولاً چند اصطلاحوں کا بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک لفظ حدیث ہے اور ایک لفظ سنت، اب یہ دونوں تقریباً مترادف الفاظ سمجھے جاتے ہیں۔ حدیث سے مراد وہی ہے جو سنت کا مفہوم ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ چیزیں، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کردہ امور جن کا تذکرہ کسی مشاہدہ کرنے والے کی طرف سے ہو کہ میں نے دیکھا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا یا یوں کیا اور تیسرے وہ امور جنہیں ہمارے مؤلفین " تقریر" کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی وہ امور جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برقرار رکھا اور اس سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کسی صحابی کو کوئی کام کرتے ہوئے دیکھا اور اسے منع نہ کیا یا خاموش رہے، تو گویا اپنی خاموشی سے آپ نے اس عمل کو برقرار رکھا۔ یعنی آپ کے سکوت سے بھی اسلامی قانون بن جاتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فریضہ ہے کہ وہ کسی برائی کو دیکھیں تو " نہی عن المنکر" کریں یعنی اپنے صحابی کے کسی ایسے فعل کو جو اسلام کے مطابق نہیں ہے آپ معاف تو کر دیں گے کہ اس صحابی نے غفلت سے یا ناواقفیت سے کیا ہے لیکن اسے روکیں گے ضرور کہ آئندہ ایسا نہ کرے۔ مختصر یہ کہ حدیث سے متعلق تین چیزیں پائی جاتی ہیں، ایک رسول اللہ کا قول، دوسرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل، تیسرا رسول اللہ کا کسی دوسرے کے قول و فعل کو برقرار رکھنا یعنی اصطلاحی طور پر رسول اللہ کی " تقریر" پہلی دو اصطلاحو یعنی حدیث اور سنت میں اب تو کوئی فرق نہیں لیکن ابتدا میں فرق تھا۔ حدیث کے معنی بولنا یعنی قول اور سنت کے معنی ہیں طرز عمل۔ اب گویا قول اور فعل دونوں ایک ہی طرح کی چیزیں ہو گئی ہیں کیونکہ بارہا صحابہ کی

نقل کردہ روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول بھی ہوتا ہے اور رسول اللہ کا عمل بھی مگر اس کے لیے حدیث کو حدیث اور سنت میں تقسیم کر کے ان کو الگ الگ کر کے جمع کرنا ناممکن بات تھی۔ اس لیے کثرت استعمال سے حدیث سے مراد قول بھی ہے اور عمل بھی۔ اسی طرح سنت سے مراد قول بھی ہے اور عمل بھی۔ اب عملاً ان میں کوئی فرق باقی نہیں ہے، جہاں تک میرے علم میں ہے۔

حدیث اور قرآن کے مابین ایک تیسری چیز بھی آتی ہے اس سے بھی واقفیت ہو جانی چاہیے۔ اگرچہ اس میں اور حدیث میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے، لیکن ایک حد تک فرق ضرور ہے وہ چیز ہے حدیث قدسی۔ حدیث قدسی کے معنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ وہ حدیث جس کے شروع میں یہ الفاظ آتے ہیں "اللہ کہتا ہے کہ ۔۔۔ فلاں فلاں" یوں ہم کہہ سکتے ہیں۔ حدیث ساری ہی اللہ کے الہام پر مبنی ہے کیونکہ یہ (وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی 4,3:53) کی آیت کے مطابق ہے۔ لیکن اگر حدیث میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صراحت فرمائیں کہ "اللہ کہتا ہے کہ فلاں چیز تو اس کو ہمارے مؤلف ایک مستقل درجے میں رکھتے ہیں اور اسے "حدیث قدسی" کا نام دیتے ہیں البتہ اس کی روایت اس کا ایک دور سے دوسرے دور تک منتقل ہونا بالکل اسی طرح ہوا جس طرح عام حدیثوں کا ہے۔ ہم ان میں کوئی فرق نہیں پاتے ہیں۔ ایسی حدیث کی ابتدا عموماً اس طرح ہوتی ہے کہ "اللہ" ضمیر متکلم کے ذریعے سے ایک امر ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ایسا کروں گا تو خدا خود کلام کرتا ہے اور اس کو رسول اللہ ﷺ ہم تک

پہنچاتے ہیں۔ اس موضوع پر قدیم زمانے ہی سے متعدد مؤلفوں نے کتابیں لکھی ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں۔ بعض چھپ بھی گئی ہیں اور بعض ممکن ہے ابھی تک قلمی حالت میں موجود ہوں۔ اس موقع پر آپ کی دلچسپی کے لیے ایک واقعہ سناتا ہوں۔ پیرس میں ایک نو مسلم لڑکی آج کل اس موضوع پر اپنے ڈاکٹریٹ کا مقالہ تیار کر رہی ہے اس لڑکی کا نام عائشہ ہے یہ بہت ذہین لڑکی ہے۔ دو سال ہوئے اس نے عربی شروع کی اور اب اس درجہ کی اسے عربی آ گئی ہے کہ ریاض الصالحین نامی سات آٹھ سو صفحوں کی ضخیم کتاب کا ترجمہ عربی سے اس نے فرنچ میں کر ڈالا ہے اور اب ایک مقالہ لکھ رہی ہے اس موضوع پر کہ "حدیث قدسی کیا ہے" اور ایسی حدیثوں کے اندر کیا کیا چیزیں ملتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس میں ہر چیز حدیث قدسی کے موضوع کی تشریح کے ساتھ ساتھ آئے گی۔ حدیث قدسی کے دو چار رسالے جو دستیاب ہیں ان میں سے بھی بعض کا وہ ترجمہ کر رہی ہے تاکہ مقالہ میں شامل کر سکے۔

حدیث کی دو بڑی قسمیں بیان کی جا سکتی ہیں ایک سرکاری مراسلے اور دوسرے صحابہ کا اپنے طور پر مراسلے یا سرکاری تحریریں۔ ہجرت سے پہلے ہی ہمیں چند چیزوں کا پتہ چلتا ہے مثلاً آپ واقف ہیں کہ تقریباً سنہ 5 نبوت میں ہجرت سے سات آٹھ سال پہلے مکے میں جب مشرکین مکہ نے مسلمانوں پر ظلم و ستم کیا تو کچھ لوگ رسول اللہ کے حکم اور اجازت سے حبشہ کو ہجرت کر گئے، اس سلسلے میں ایک دستاویز ہمیں ملتی ہے۔ ممکن ہے آپ میں سے بعض اس سے واقف بھی ہوں کہ اس کا ذکر سیرت کی کتابوں میں آتا ہے یہ ایک خط ہے جو

رسول اللہ نے اپنے چچازاد بھائی جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیا کہ یہ خط نجاشی کو جو حبشہ کا حکمران تھا پہنچا دیں۔اس کے آخر میں الفاظ یہ ہیں:

"میں اپنے چچازاد بھائی جعفر کو تیرے پاس بھیج رہا ہوں اس کے ساتھ کچھ اور بھی مسلمان ہیں جب یہ تیرے پاس پہنچیں تو ان کی مہمانداری کرنا۔"

ظاہر ہے کہ خط پر تاریخ نہ ہونے کے باوجود یہ خط ہجرت حبشہ کے زمانے ہی کا ہو سکتا ہے۔اسی طرح ہمیں اس زمانے کی ایک اور چیز ملتی ہے جو کافی دلچسپ کہی جا سکتی ہے۔ بعض لوگوں کو اس پر حیرت بھی ہوتی ہے۔ یہ تمیم داری کا واقعہ ہے۔ تمیم داری شام کے رہنے والے ایک عیسائی تھے۔ وہ مکہ آتے ہیں، اسلام قبول کرتے ہیں اور پھر اپنے قصے بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ ایک جہاز ران تھے بہت سے بحری سفر کر چکے تھے۔ جن کا تفصیل کے ساتھ "صحیح مسلم" میں ذکر آیا ہے۔ تمیم داری نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا کہ مجھے یقین ہے کہ آپ کی فوج بہت جلد میرے وطن یعنی شام کو فتح کرے گی جب یہ ہو تو مجھے فلاں فلاں گاؤں بطور جاگیر مرحمت فرمائیں۔تاریخی کتابوں کے مطابق رسول اللہ نے ایک پروانہ لکھوایا اور اس کو دیا۔اس کے الفظ یہ ہیں کہ اگر مرطوم، خبرون (اور چند گاؤں کے نام ہیں) وغیرہ فتح ہو جائیں تو تمیم داری کو دیے جائیں۔ غرض یہ بھی ہجرت مدینہ سے پہلے کی تحریری چیزوں میں ایک چیز کہی جاتی ہے۔اسی طرح کچھ اور چیزیں ہمیں ملتی ہیں۔ دوسرا مختصر دور ہجرت کا وقت ہے۔ یعنی مکہ سے مدینہ کے سفر کے دس بارہ دن کا زمانہ۔اس زمانے میں بھی ہمیں بعض تحریری چیزوں کا پتہ چلتا ہے۔مثال کے طور پر سراقہ بن مالک کا

واقعہ ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعاقب کیا۔ چاہا کہ آپ کو گرفتار کر لے اور قریش کے ہاتھ حضور کو بیچ دے۔ کیونکہ قریش نے اعلان کیا تھا کہ جو محمد کو گرفتار کرے گا اسے اتنا انعام دیا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ اس اثناء میں کئی معجزات بھی پیش آئے۔ کہتے ہیں کہ آخر میں سراقہ نے معافی چاہی۔ رسول اللہ نے اسے معاف کیا تو اس پر اس نے درخواست کی کہ مجھے پروانہ امن دیا جائے۔ ہمارے راوی بیان کرتے ہیں کہ اس ہجرت کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دوات قلم اور کاغذ بھی موجود تھا اور حضورؐ کے ہمراہیوں میں لکھنا پڑھنا جاننے والا ایک غلام بھی موجود تھا جس کا نام عامر بن فہیرہ تھا۔ چنانچہ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے املا کروایا، جس میں سراقہ بن مالک کو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے امن اور پناہ دینے کا ذکر تھا۔ بعد میں سراقہ مسلمان ہو گیا اور جس وقت وہ مسلمان ہونے کے لیے آیا اس نے بتایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ پروانہ میرے پاس ہے، چنانچہ اس تحریر کی اساس پر صحابہ نے اسے قریب ہونے کا موقعہ دیا، باوجود ہجوم کے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گیا اور گفتگو کی۔ اسے ہجرت کے زمانے کی تحریروں میں شامل کیا جائے گا۔ ایسی چیزیں زیادہ تو نہیں ہیں۔ غالباً ہجرت کے دوران کی یہ واحد مثال ہے۔ مگر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ پہنچے تو اب سرکاری تحریروں کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ ان میں کچھ سرکاری کاغذات ہیں اور کچھ تحریریں خالص پرائیویٹ قسم کی ہیں۔ بعض تحریریں ایسی ہیں جن کی کوئی توقع بھی نہیں ہو سکتی کہ ایسی چیزیں بھی اس زمانے میں پائی جاتی ہوں گی۔ مثلاً " صحیح بخاری" میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جتنے لوگ مسلمان ہوئے ہیں ان کے نام لکھو۔ چنانچہ مردم شماری کی گئی۔ صحیح بخاری کے مطابق اس فہرست میں پندرہ

سو نام لکھے گئے۔ مردوں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں سب کی تعداد پندرہ سو کی تعداد ایسی ہے کہ میرے خیال میں ہجرت سے عین بعد کی معلوم ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کہ مکہ سے آئے ہوئے مہاجرین دو سو خاندان ہوں گے تو پانچ سو کے لگ بھگ افراد ہونے چاہئیں۔ اسی طرح اس میں مدینہ منورہ کے مسلمان بھی ہوں گے تو اس طرح پندرہ سو مسلمانوں کا ہونا ہجرت کے ابتدائی سالوں کا واقعہ معلوم ہوتا ہے، بہت بعد کا نہیں۔ کیونکہ بعد میں مسلمانوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ شمار نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً حجۃ الوداع میں ایک لاکھ چالیس ہزار حضرات فریضہ حج ادا کرنے کو آئے تھے تو پندرہ سو اور ایک لاکھ چالیس ہزار میں ظاہر ہے کوئی نسبت نہیں پائی جاتی۔ مردم شماری کے علاوہ ایک اور چیز بھی ملتی ہے جس کا تعلق غالباً سنہ ۱ھ سے ہے اس کی بھی ہمیں کوئی توقع نہیں تھی۔ یہ بھی ایک عجیب و غریب چیز ہے۔ پہلے میں بتا دوں کہ یہ ایک دستور مملکت ہے۔ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ جیسا کہ معلوم ہے کہ ہجرت کے موقع پر قریش کی اذیت کے باعث مکے کے مسلمان اور آخر میں خود رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے تھے۔ اب اگر قریش چپ رہتے تو شاید مسلمان جلدی ہی اپنی مصیبت، اپنی جائیداد کی تباہی، اپنے وطن سے بے وطنی وغیرہ کو بھی بھول جاتے اور نئے ملک اور نئے وطن میں نئی زندگی کا آغاز کر لیتے لیکن قریش مکہ نے ان کو چین لینے نہ دیا۔ قریشیوں کو یہ دیکھ کر کہ ان کے دشمن، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاتھ سے بچ کر چلے گئے ہیں، اتنی جلن ہوئی اور اتنا غصہ آیا کہ مدینہ والوں کو ایک خط لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا دشمن تمہارے ملک میں آیا ہے یا تو اس کو مار ڈالو یا اس کو اپنے ملک سے نکال دو، ورنہ ہم مناسب تدبیریں اختیار کریں گے۔ ظاہر ہے کہ مدینے کے مسلمان ان میں سے کسی بات کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ آخری دھمکی یا الٹی میٹم

کہ ہم مناسب تدبیریں اختیار کریں گے، اگر کوئی حکمران جاہل یا غافل ہوتا تو اس کو غیر اہم چیز سمجھ کر نظر انداز کر دیتا لیکن جس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اسوہ حسنہ بننا تھا ان کے لیے ضروری تھا کہ اپنے بعد آنے والے حکمرانوں کو بتائیں کہ ان حالتوں میں کیا کرنا چاہیے، یعنی دشمن خاص کر قومی دشمن سے اپنے اور اپنی قوم کے مفادات کو محفوظ رکھنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کرنا چاہئیں۔ چنانچہ آپ نے دو تین احتیاطی تدابیر اختیار فرمائیں پہلی تدبیر یہ تھی کہ جو لوگ ہجرت کر کے بے وطن ہو کر ایک نئے ملک میں آئے تھے اور جن کے پاس، ان کے بدن کے کپڑوں کے سوا، کوئی چیز نہ تھی، ان کی گزر بسر کا انتظام کیا۔ آپ لوگوں کو پاکستان میں مہاجرین کے مسائل کے پیش نظر اچھی طرح واقفیت ہے کہ یہ کتنا دشوار کام ہے۔ برسوں گزر جانے کے بعد بھی مہاجرین کی ساری گتھیاں، ساری دشواریاں حل نہیں ہو پائیں، اور پھر باوجود ان وافر وسائل کے جو موجودہ زمانے میں ہمارے پاس ہیں اور باوجود اس حقیقت کے کہ ہماری حکومت کی آمدنی کروڑوں روپے کی ہے، ہم مہاجرین کے مسائل آسانی سے حل نہیں کر سکے۔ پاکستان ہی میں نہیں، جرمنی وغیرہ جیسے بہت سے ممالک میں یہ واقعات پیش آئے ہیں اور ہر جگہ یہ ایک نہایت ہی دشوار اور پیچیدہ مسئلہ رہا ہے۔ جو لوگ مدینہ آئے تھے ان کی تعداد اگرچہ زیادہ نہیں تھی۔ شاید چند سو آدمی ہوں گے لیکن اس زمانے میں وسائل بہت کم تھے۔ ان چند سو آدمیوں کو ایک چھوٹی سی بستی میں مستقل گزر بسر کے وسائل فراہم کر دینا آسان کام نہیں تھا۔ تقریباً اتنا ہی مشکل کام تھا جتنا کسی بڑے ملک میں آج کل مثلاً ایک ہزار کی جگہ ایک لاکھ یا دس لاکھ افراد کا آنا۔ تو ایسی ہی دشواری اس وقت پیدا ہوئی ہوگی۔ مگر اس مشکل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سیاسی فراست سے ایک لمحے میں حل کر لیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر مدینہ

کے ان لوگوں کو بلایا جو نسبتاً خوشحال تھے اور ساتھ ہی مکی مہاجرین کے ان نمائندوں کو بھی بلایا جو اپنے اپنے خاندان کے سربراہ تھے۔ جب دونوں جمع ہو گئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کی سفارش کرتے ہوئے انصار سے خطاب فرمایا کہ یہ تمہارے بھائی ہیں، تمہارے ہی دین والے ہیں اور اس دین ہی کی خاطر اپنے وطن، اپنے ملک اور اپنی ہر چیز کو چھوڑ کر یہاں آئے ہیں۔ اس لیے تمہارا فریضہ ہے کہ ان کی مدد کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز کی کہ انصار میں سے ہر خاندان مکہ والوں کے ایک خاندان کو اپنے خاندان میں شامل کر لے۔ مواخاۃ یا بھائی چارہ کا مفہوم یہ نہیں کہ یہ کوئی طفیلی Parasite کے طور پر مفت خوری کرنے والے مہمانوں کی طرح رہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب بجائے چھوٹے خاندانوں کے بڑا خاندان ہو گا۔ بجائے دو آدمیوں کے چار آدمیوں کا خاندان ہو گا اور دونوں خاندان کام کریں گے۔ جب کام زیادہ کیا جائے گا تو آمدنی زیادہ ہو گی۔ آمدنی زیادہ ہو گی تو دونوں کی گزر بسر کا انتظام بآسانی ہو سکے گا۔ کوئی شخص کسی خاندان پر بار نہیں بنے گا۔ اس لیے سب ہی نے یہ تجویز بخوشی قبول کر لی۔ مواخات کے اس اصول کا یہ نتیجہ نکلا کہ کئی سو خاندان ایک لمحے میں گزر بسر کے انتظامات حاصل کرنے کے قابل ہو گئے اور پھر اس کے بعد کبھی یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوا کہ کون خوش حال ہے کون بے روزگار ہے، کون پناہ دہندہ ہے اور کون باہر سے آیا ہوا مہاجر ہے۔ اس اہم کام سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور امر کی طرف توجہ فرمائی وہ یہ کہ اس زمانے سے پہلے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے مدینہ میں کوئی ریاست یا مملکت نہیں پائی جاتی تھی۔ وہاں آبادی کا ایک گروہ تھا جو قبیلوں میں بٹا ہوا تھا۔ تقریباً پچیس تیس قبیلے تھے اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلے سے اتنا ہی آزاد اور خود مختار تھا

جتنا آج کل کی دنیا کی سلطنتیں ہوتی ہیں اور اس خود مختاری کا نتیجہ بھی وہی تھا جو آزاد مملکتوں میں ہوتا ہے یعنی آپس میں جنگ بھی ہوتی ہے۔ ہمارے مؤرخوں نے لکھا ہے کہ مدینے کے انصار درحقیقت دو بڑے قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے (بلکہ دو بڑے گروہوں میں، اور ہر گروہ میں کئی قبیلے تھے) یعنی اوس اور خزرج۔ ان دونوں میں ایک سو بیس سال سے خانہ جنگیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ظاہر ہے کہ جب دو قبیلوں میں جنگ ہو رہی ہو تو دونوں کی مشترکہ حکومت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مدینہ میں ان عربوں کے علاوہ اور بھی لوگ آباد تھے۔ مثلاً یہودیوں کے قبائل وہاں تھے۔ ان کی کئی ہزار کی آبادی تھی تخمیناً نصف آبادی یہودیوں پر مشتمل تھی اور نصف آبادی عربوں پر۔ یہودیوں کے علاوہ کچھ عیسائی بھی تھے جن کی صحیح تعداد معلوم نہیں۔ ایک روایت میں پندرہ، ایک روایت میں پچاس کا ذکر ملتا ہے اور یہ قبیلہ اوس کے اندر تھے۔

بہر حال اس آبادی میں جس میں یکجہتی نہیں پائی جاتی تھی، ایسا انتظام کرنا کہ سب کی مشترکہ حکومت قائم ہو یہ بظاہر خیال و خواب کی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کی ضرورت تھی، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے مہاجرین کی مواخات کے ذریعے سے گزر بسر کا انتظام کرنے کے بعد جو کام کیا وہ یہ تھا کہ ان سارے گروہوں کے نمائندوں کو اپنے پاس بلایا، مسلمان بھی یہودی بھی، صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ میرے والد کے مکان پر یہ اجتماع ہوا۔ اس میں یہودیوں کے نمائندے بھی تھے، عربوں کے بھی۔ عربوں میں اوس کے نمائندے بھی تھے، خزرج کے بھی۔ اسلام قبول کرنے والے

اوس اور خزرج کے نمائندہ بھی اور وہ بھی جو تا حال مسلمان نہیں ہوئے تھے، اور مہاجرین کے نمائندے بھی تھے۔ ان سب کو جمع کیا اور ان سے مخاطب ہو کر غالباً یہ فرمایا (کیونکہ صراحت نہیں ملتی کہ اجتماع میں کیا چیز شروع میں پیش آئی) کہ آپ اس وقت مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں اور بالکل ایک دوسرے سے آزاد ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ اگر ایک قبیلہ پر اس کا دشمن باہر سے حملہ آور ہوتا ہے تو باقی سب لوگ غیر جانبدار رہتے ہیں اور اس قبیلہ کو دشمن کی مجموعی قوت سے تنہا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اسے شکست ہو۔ پھر کچھ دنوں کے بعد دوسرے قبیلے پر کوئی بیرونی دشمن حملہ آور ہو اور اسی طرح تیسرے اور چوتھے پر تو نتیجہ یہی ہو گا کہ رفتہ رفتہ دشمنوں کے ہاتھوں سب ختم ہو جاؤ گے۔ اس لیے، کیا یہ مناسب نہیں کہ تم سب قبیلے اپنی ایک مشترکہ حکومت قائم کرو تاکہ تمہاری مشترکہ حکومت کے باعث دشمن کو بھی یہ خوف ہو کہ ہمارا ایک دشمن نہیں، بلکہ بہت سے قبیلے وہاں موجود ہیں وہ سب ہمارا مقابلہ کریں گے اور ہم اپنی تنہا قوت پر اس سارے شہر مدینہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ ایک مشترکہ معاہدہ ہے جو دشمنوں سے تمہارے تحفظ، تمہارے معاشی اور مالی فوائد کا ضامن ہو گا۔ تجویز معقول تھی اس لیے سبھوں نے یا کم از کم اکثر قبیلوں نے قبول کر لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اکثر کا لفظ صحیح ہے کیونکہ اس واقعہ کا ذکر ملتا ہے کہ اوس کے چار قبیلے شروع میں اس میں شریک نہیں تھے۔

بہر حال اہل مدینہ کے اجتماع کا مقصد صرف یہی نہ تھا جو میں نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا ہوگا کہ تمہاری مشترکہ قوت تم سب کی حفاظت کا باعث ہوگی۔ بلکہ ایک اور چیز بھی تھی جس کو ہم اس دستور کے اندر دیکھتے ہیں اور جس پر سب نے اتفاق کیا، وہ یہ کہ ہر قبیلے کو بہت سے امور میں حسب سابق کامل آزادی رہے گی صرف چند چیزوں کے متعلق یہ وضاحت کی گئ کہ وہ بجائے انفرادی کے مشترکہ ہوں گی اور مرکزی حکومت سے متعلق رہیں گی۔ ان مرکزی امور میں سے ایک عسکری مسئلہ بھی تھا یعنی جنگ۔ اجنبیوں سے جنگ کرنا اور صلح کرنا ناقابل تقسیم قرار دیا گیا یعنی یہ نہ ہوگا کہ جنگ صرف ایک قبیلہ سے ہو اور صلح صرف ایک قبیلہ سے ہو اور باقی لوگ اس میں شریک نہ ہوں بلکہ آئندہ سے صلح اور جنگ ناقابل تقسیم، ایک مشترکہ مسئلہ سمجھی جائے گی۔ اسی طرح انشورنس (یعنی بیمہ زندگی) کا ایک انتظام کیا گیا جس کی تفصیل میں آگے بیان کروں گا۔ یہ سب گویا مشترکہ امور قرار پائے۔

عدالت کے متعلق ایک حد تک قبائلی نظام برقرار رکھا گیا لیکن اگر فریقین مقدمہ دو مختلف قبیلوں کے ہوں تو مرکز سے رجوع کرنا ہوگا، اپیل کورٹ کو (اگر ہم ایسا کہہ سکیں) مشترکہ قرار دیا گیا، یعنی جھگڑوں کے آخری فیصلے کے لیے شہر کے حکمران سے رجوع کیا جائے گا۔ اسی طرح اس میں اس بات کا بھی ذکر ہے کہ مذہبی آزادی ہوگی۔ یہود کے لیے یہود کا دین رہے گا، مسلمانوں کے لیے مسلمانوں کا دین، دین میں مذہب، قانون اور عدل گستری سب داخل سمجھے گئے، وغیرہ وغیرہ۔ ایک دستاویز مرتب کی گئ جو ہم تک لفظ بہ لفظ

پہنچی ہے اور اس کی 52 دفعات ہیں ان میں تفصیل بتائی گئی ہے کہ کیا کام انجام دینے چاہئیں۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ اس وقت کی اسلامی مملکت کا تحریری دستور تھا۔

ابھی میں نے اشارتاً کہا کہ اس میں کچھ انشورنس کا بھی ذکر ہے۔ یہ ایک عجیب و غریب شے ہے۔ قدیم زمانے میں وہ ضرورتیں جو آج پائی جاتی ہیں نہیں پائی جاتی تھی، اس زمانے کی جو ضرورتیں تھیں وہ آج کل ہمارے لیے بے سود نظر آتی ہیں۔ قدیم زمانے میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں، مدینہ منورہ میں دو مسئلے بہت اہم تھے۔ ایک یہ کہ اگر کوئی شخص غلطی سے (یعنی عمداً نہیں) کسی شخص کے قتل کا مرتکب ہوتا تو اسے خون بہا دینا پڑتا تھا۔ خون بہا کی رقم رواج و قانون کے مطابق اتنی زیادہ تھی کہ عملاً ساری آبادی میں سے ایک آدھ شخص ہی اس کو ادا کر سکتا تھا۔ دوسرے لوگوں کے لیے وہ ناممکن سی بات تھی، یعنی ایک سو اونٹ کی قیمت کا اندازہ یوں کیجئے کہ ایک اونٹ سو آدمیوں کے لیے دن بھر کی پوری غذا کا کام دیتا ہے۔ اس حساب سے سو اونٹ کے معنی ہوئے دس ہزار دن تک ایک شخص کو غذا مہیا کرنا۔ یہ ہوتا تھا خون بہا۔ اتنی بڑی رقم دینا اتنا بڑا خون بہا ادا کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ سوائے مال دار سردار قبیلے کے کسی اور شخص کے لیے یہ ناممکن تھا۔ لیکن یہ واقعات روزمرہ پیش آتے تھے اس کے لیے اجتماعی انشورنس کا انتظام کیا گیا یعنی ایک قاتل ہی اس کا ذمہ دار نہ ہو گا بلکہ پوری انشورنس کمپنی اس کی ذمہ داری قبول کرے گی اور اس کی طرف سے خون بہا ادا کرے گی۔ دوسری چیز جس کی اس زمانے میں ضرورت تھی

اور آج ہمارے عہد میں اس کی ضرورت عملاً نظر نہیں آتی وہ یہ ہے کہ کسی شخص کو دشمن گرفتار کر کے قید کرلے تو وہ فدیہ دے کر اپنی آزادی حاصل کرتا تھا۔ یہ فدیہ بھی بہت گراں تھا یعنی سو اونٹ فدیہ دینا ہوتا تھا۔ کوئی غریب شخص گرفتار کر لیا جاتا تو اس کی رہائی کی کوئی صورت نہ ہوتی تھی۔ وہ عملاً اپنے دشمن کا غلام بن جاتا۔ ایسے وقت میں انشورنس کمپنی کام دیتی۔ اس کی طرف سے ذمہ داری قبول کرتی اور فدیہ ادا کرتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتظام کیا کہ مدینہ منورہ میں ہر ہر قبیلے میں ایک انشورنس یونٹ قائم ہوا اور یہ کہا کہ تمہارے قبیلے کے کسی آدمی کو قتل یا گرفتاری کے سلسلے میں رقم ادا کرنی ہو اور وہ شخص ادا نہ کر سکے تو یہ انشورنس یونٹ ادا کرے گی اور اگر کسی یونٹ کے پاس اتنی گنجائش نہ ہو تو حکم تھا کہ اس کی قریبی محلے کی انشورنس یونٹ جو ہے اس کے ساتھ تعاون کر کے رقم ادا کرے اور اگر اس کے پاس بھی نہ ہو تو دوسری یونٹ سے انتظام کیا جائے۔ جب ساری آبادی کی انشورنس یونٹیں بھی بار نہ اٹھا سکیں تو ایسی صورت میں مرکزی حکومت بھی مدد کرے گی۔ یہ ایک خاص نظام تھا جو مدینہ منورہ میں قائم کیا اور اس دستور کے اندر ضبط تحریر میں لے لیا گیا۔ غرض سرکاری طور پر حدیث کے لکھوانے کی ایک مثال یہ دستور مملکت مدینہ کی دستاویز بھی ہے۔ ان ابتدائی کاموں میں ایک اور چیز یہ ہے کہ جب مہاجرین کی بسر و بود کا انتظام مواخات کے ذریعے کر دیا گیا اور اس کے بعد شہری مملکت وجود میں آ گئی یعنی ایسی مملکت جس کا رقبہ صرف ایک شہر تھا اور اس کے اندر عدالت اور قانون غرض ساری چیزوں کا انتظام کر دیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی پر اکتفا نہیں فرماتے ہیں، آپ مکہ کے الٹی میٹم کے جواب میں ایک اقدام فرماتے ہیں وہ اقدام یہ تھا، کہ مدینہ منورہ کے اطراف کا آپ دورہ شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً شمال کی طرف جاتے ہیں وہاں

کے قبیلوں سے کہتے ہیں تم اس وقت ایک آزاد قبیلہ ہو اور خود مختار ہو، لیکن دشمن سے مقابلہ ہو تو تنہا ہو گے۔ کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ ہم دونوں میں ایک حلیفی معاہدہ ہو جائے۔ تم پر کوئی دشمن حملہ کرے تو ہم تمہاری مدد کو دوڑیں گے، اگر ہم پر کوئی دشمن حملہ کرے اور ہم تمہیں بلائیں تو تم بھی ہماری مدد کو آنا۔ یہ بات ان کے دل کو لگی اور ان کے ساتھ معاہدہ ہو گیا۔ یہ معاہدہ تحریری طور پر عمل میں آیا اور وہ ہم تک پہنچا ہے۔ پھر آپ مشرق کی طرف جاتے ہیں، پھر جنوب کی طرف، غرض مختلف علاقوں میں، مدینہ کے اطراف میں وقتاً فوقتاً دورہ کر کے ہجرت کے پہلے اور ہجرت کے دوسرے سال مختلف غیر مسلم قبائل سے حلیفی کے معاہدے کیے گئے اور یہ معاہدے تحریری صورت میں لائے گئے اس کے بعد اس کا سلسلہ اور چلتا رہا۔ غرض یہ ابتدائی نظام تھا کہ ایک طرف مدینے کے اندر امن و امان کا اور یکجہتی کا انتظام کیا جائے اور مدینے کے اطراف میں دوست قبائل کا جال پھیلا دیا جائے تاکہ دشمن اگر حملہ کرے تو اولاً اسے ہمارے آس پاس کے قبیلوں سے جنگ کرنا پڑے اور ہم محفوظ رہیں، یہ سیاسی تدبیر تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور جس کے سلسلے میں تحریر کا بار بار ذکر آیا ہے۔

اس کے بعد اور بے شمار چیزیں ایسی ملتی ہیں جو تحریراً عمل میں آئیں ان میں سے بعض چیزیں پرائیویٹ ہیں۔ مثلاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک غلام خریدتے ہیں اس کا پروانہ موجود ہے کہ میں نے یہ غلام فلاں شخص سے خریدا، اتنی رقم دی گئی یا ایک غلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آزاد فرماتے ہیں، اسے آزادی

کا تحریری پروانہ دیا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو آزاد کیا جاتا ہے، اسے سب تسلیم کر لیں کہ یہ شخص آزاد ہے، اب آئندہ اسے غلام نہ قرار دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ ایک اور چیز ذرا بعد کی ہے غالباً ۸ ہجری میں رسول اللہ ایک شخص کو خط لکھتے ہیں کہ " جیسے ہی یہ پیغام رساں پہنچے زمزم کا پانی صبح ہو کہ شام فوراً اُس کے ہاتھ مجھے بھیجو "۔ اسی طرح مثلاً جب اسلامی مملکت توسیع پاتی ہے تو مختلف اضلاع اور صوبوں کے گورنروں کے نام پروانے بھیجے جاتے ہیں کہ فلاں کام انجام دو۔ یا گورنر خود دریافت کرتا ہے کہ اس خاص صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ تو اس کا جواب مدینہ سے بھیجا جاتا ہے۔ غرض سرکاری تحریروں کی کثیر تعداد ہے اور اس وقت ان کی تعداد جو ہم تک پہنچی ہے، کم سے کم چار سو مکتوبات نبی پائے جا چکے ہیں جن میں کچھ تبلیغی بھی ہیں۔ مثلاً قیصر و کسریٰ کو دین اسلام کی دعوت دی گئی ہے۔ کچھ حلیفی کے معاہدے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اب تحریری حدیث کا دوسرا پہلو لیجئے یعنی وہ حدیثیں جو سرکاری تحریریں نہیں ہیں بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اسے نجی طور پر مرتب کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ عام طور پر صحابہ کرامؓ امی تھے۔ لکھنا پڑھنا انہیں نہیں آتا تھا لیکن اچھے مخلص مسلمان ضرور تھے۔ جب مدینہ میں ہوتے تو اکثر مسجد نبوی میں حاضر ہوتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو سنتے، اس پر عمل کرتے۔ لیکن ایک واقعہ ایسا پیش آیا جو غالباً آغاز ہے حدیث کے مدون کرنے کا۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک دن ایک صحابیؓ آئے، ان کا نام بیان نہیں ہوا ہے۔ ترمذی میں یہ حدیث موجود ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا " یارسول اللہ ﷺ ! آپ

روزانہ جو چیزیں ہمیں بیان کرتے ہیں وہ بے حد دلچسپ، بے حد اہم اور ضروری ہوتی ہیں لیکن میرا حافظہ کمزور ہے، میں انہیں بھول جاتا ہوں، کیا کروں؟ حضور صلی اللہ علیہ و سلم نے جواب میں الفاظ فرمائے "استعن بیمینک" (اپنے سیدھے ہاتھ سے مدد لو) یعنی لکھ لیا کرو۔ غالباً انہوں نے اس اجازت سے فائدہ اٹھایا ہوگا اور لکھا ہوگا۔ ہمیں، بعد میں کیا ہوا، اس کے متعلق تفصیل نہیں ملتی۔ بعد میں ایک دوسرا واقعہ جو غالباً اسی حکم اور "استعن بیمینک" کے الفاظ کا نتیجہ سمجھنا چاہیے وہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے۔ یہ نوجوان تھے غالباً سولہ سترہ سال کی عمر ہوگی۔ بے حد ذہین، بے حد دیندار اور علمی ذوق رکھنے والے تھے۔ ان کے علمی ذوق کا اندازہ اس سے کیجئے کہ بعد میں انہوں نے سریانی زبان بھی سیکھی اور وہ عیسائیوں کی دینی کتاب انجیل کو سریانی زبان میں پڑھ بھی سکتے تھے۔ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے اجازت بھی دی تھی کہ اپنے علمی مشاغل جاری رکھیں۔ یعنی قرآن کے ساتھ ساتھ بائیبل بھی پڑھ سکتے ہیں۔ غرض عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب یہ سنتے ہیں کہ فلاں شخص کو حضور صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا "استعن بیمینک" تو انہوں نے خود لکھنا شروع کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم سے جو کچھ بھی سنتے اسے فوراً نوٹ کر لیتے تھے۔ دو چار دن غالباً اسی طرح کا واقعہ گزرا ہوگا، پھر ان کے دوستوں نے ان سے کہا "اے عبداللہ یہ تم کیا کر رہے ہو؟ رسول اللہ ﷺ بشر ہیں، کبھی خوش ہوتے ہیں، کبھی خفا ہوتے ہیں، تم ان کی ہر چیز نوٹ کرتے جا رہے ہو، یہ مناسب نہیں۔ کوئی اور شخص ہوتا تو وہ ان کے کہنے پر عمل کرتا اور اسے چھوڑ دیتا، مگر وہ ذہین تھے۔ انہوں نے سوچا کہ بجائے ان سے مشورہ لینے یا ان کی بات ماننے کے کیوں نہ براہ راست اصل سے رجوع کیا جائے۔ ان کے استفسار پر حضور صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا، ضرور لکھو۔ اطمینان کے لیے وہ پوچھتے ہیں کہ کیا اس وقت بھی جب آپ خفا ہوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب یہ ہے "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یہاں سے جو چیز نکلتی ہے (اپنے منہ کی طرف اشارہ فرمایا) وہ حق ہی ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ پورے اطمینان کے ساتھ حدیثوں کو لکھتے رہے۔ بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے مجموعہ احادیث میں کوئی دس ہزار حدیثیں تھیں اور اس کے بعد ان کے بیٹے اور ان کے پوتے اس قلمی نسخے کی مدد سے دوسرے لوگوں کو حدیث کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ عمرو بن شعیب بن عبداللہ بن عمرو بن العاص مشہور محدث گزرے ہیں۔

ایسی اور بھی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً ابو رافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک آزاد شدہ غلام تھے وہ بھی ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر کہتے ہیں کہ کیا میں آپ کی حدیثوں کو لکھ سکتا ہوں؟ حضور نے انہیں بھی اجازت دے دی۔ انہوں نے بھی مجموعہ تیار کیا ہو گا۔ ان میں سب سے اہم حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ ان کا قصہ یہ ہے کہ ہجرت کے وقت ان کی عمر دس سال کی تھی۔ بہت کم سن بچے تھے لیکن ایک ایسے بچے جس کے والدین نہایت مخلص مسلمان تھے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود فرماتے ہیں کہ جب مدینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو میری والدہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر جا کر حضور کے سامنے پیش کیا اور بہت ہی فخر کے ساتھ کہنے لگیں "یا رسول

اللہ ﷺ ! میرا بچہ لکھنا پڑھنا بھی جانتا ہے" ٹھیک اسی طرح جیسے آج ہم آپ کہیں کہ میرا بیٹا ڈاکٹریٹ یعنی پی ایچ ڈی کی ڈگری لے چکا ہے غرض بڑے فخر سے بیان کرتی ہیں اور پھر کہتی ہیں "یا رسول اللہ ﷺ ! میری عزت افزائی کا باعث ہوگا کہ اگر اسے آپ خادم کے طور پر قبول کر لیں۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میری والدہ کی درخواست کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کیا چنانچہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان میں آپ کی وفات تک رہا۔ اس دس سال کے عرصہ میں ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری و باطنی زندگی کو دیکھتا۔ مسجد میں آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے ہیں وہ بھی دیکھتا، مکان کے اندر اپنی ازواج مطہراتؓ سے کس طرح برتاؤ کرتے ہیں، کیا کھاتے ہیں، کس طرح سوتے ہیں، غرض ہر چیز کا میں مشاہدہ کر سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ سہولت، جو ان کو حاصل تھی بڑے سے بڑے صحابہ مثلاً حضر ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی میسر نہیں آسکتی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو اس قدر قریب سے دیکھیں۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کے زمانے میں مسلمانوں کی جماعت کی تعداد بڑھی اور انہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوا تو میرے پاس بہت سے شاگرد آیا کرتے تھے۔ اس بارے میں ان کی روایت کے دو الفاظ ہیں "اذا کثروا" (جب ان کی تعداد زیادہ ہوتی) اور "اذا اصروا" (اور جب وہ زیادہ اصرار کرتے) بہر حال جو بھی صحیح ہو، حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایسے موقع پر میں ایک صندوق میں سے ایک پرانا رجسٹر یا پرانی کتاب نکالتا اور اپنے شاگردوں کو بتاتا اور کہتا کہ یہ وہ چیز ہے جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نوٹ کی ہے اور اسے

رسول اللہ کے حضور میں وقتاً فوقتاً پیش بھی کیا ہے۔ میری تحریر میں اگر کوئی کمی یا غلطی ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اصلاح فرما دیتے۔ یہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مجموعہ ہے جو یقیناً کئی ہزار حدیثوں پر مشتمل ہوگا۔ یہ ایک ایسی حدیث کی کتاب کہی جا سکتی ہے جو صحیح ترین حدیث کی کتاب ہے، کیونکہ لکھنے کے بعد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر نظر ثانی فرماتے، یعنی سن کر اس کی اصلاح فرماتے ایسی اور مثالیں بھی ملتی ہیں۔ غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں، ان کی اجازت سے، ان کے حضور میں حدیث کی تدوین ہو رہی تھی۔ بخاری شریف میں دو ہزار سے زیادہ حدیثیں نہیں ہیں جبکہ بعض روایات کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مجموعہ احادیث میں دس ہزار حدیثیں تھی۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کتنی کثیر حدیثیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تحریری طور پر مدون ہو چکی تھیں۔ بد قسمتی میں وہ سب کی سب کتابی صورت میں ہمارے پاس نہیں پہنچیں بعد کے مؤلفوں نے ان کو تتر بتر کر دیا ہے۔ یعنی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیثوں میں سے ایک حدیث کو ایک باب میں دوسری حدیث کو دوسرے باب میں تحریر کیا ہے۔ اس طرح ان کا جو اصل مجموعہ تھا وہ ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ بہر حال یہ بالکل واضح ہے کہ عہد نبوی میں حدیثوں کی جمع و تدوین کا آغاز ہو چکا تھا اور اس میں اضافہ بھی ہوتا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہم کو ایسے صحابہ کی تعداد روز افزوں نظر آتی ہے جو اپنی یادداشتوں کو مدون کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں انہیں خیال نہیں آیا، اب انہیں احساس ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم باقی نہ رہے میں بھی آج نہیں کل مرنے والا ہوں، اگر میں اپنی یادداشتوں کو محفوظ نہ کر سکا تو یہ سب

ضائع ہو جائیں گی۔ کم از کم میں خود اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات تحریر کر لوں۔ چنانچہ ایسی متعدد کتابوں کا ذکر حدیث کی کتابوں میں آتا ہے۔ حضرت سمرہ بن جندب، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے بہت سے صحابہ تھے جنھوں نے کتابیں اور رسالے لکھ ڈالے۔ ان مجموعہ ہائے حدیث میں سے ایک کے متعلق ابن حجر نے لکھا ہے "فیہ علم کثیر " (اس میں بہت علم ہے)۔ ایک اور رسالے کے متعلق لکھا ہے کہ بہت ضخیم تھا۔ یہ جمع حدیث کی ایک صورت ہوئی۔ ایک دوسری صورت تدوین حدیث کی یہ ہے کہ لوگ صحابہ سے لکھ کر پوچھتے تھے۔ مثلاً ایک شخص کو کسی مسئلے کے متعلق کچھ دریافت کرنا ہے تو وہ کسی بزرگ صحابی کو اس خیال سے ممکن ہے وہ جانتے ہوں ایک خط لکھتا ہے۔ وہ صحابی جواب میں حدیث لکھ بھیجتے ہیں کہ ہاں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے یا رسول اللہ کو یہ کرتے دیکھا ہے۔ غرض خط و کتابت کے ذریعے سے حدیث کی تدوین اور حدیث کی تعلیم کا یہ سلسلہ ہمیں نظر آتا ہے اور اس میں ایسی بڑی شخصیتیں بھی ہیں جیسے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ان کے ہاں اکثر خطوط آیا کرتے تھے اور وہ جواب لکھوا کر بھیجتیں۔ حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوسرے صحابی ہیں اور ان کے متعلق صحیح بخاری میں یہ مذکور ہے کہ ان کے پاس ایک خط آیا جس کا انہوں نے جواب لکھ بھیجا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی یہی حال تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے خلیفہ وقت ان سے لکھ کر دریافت کرتے کہ اس بارے میں آپ کی کیا معلومات ہیں۔

اب میں ایک اور خاص پہلو کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے جب حدیثوں کو اس طرح لکھ کر مدون کرنا شروع کیا اور اس کی تعلیم اپنے زمانے کے نوجوان مسلمانوں کو دینے لگے تو ابتداءً صحابہ کے ناموں کے تحت حدیثیں مدون ہوئیں۔ مثلاً میں اپنے شہر میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی کے پاس جا کر سبق لیتا ہوں اور ان سے سنی ہوئی حدیثوں کو جمع کرتا ہوں۔ دوسرے شہر میں رہنے والے صحابہؓ سے مجھے استفادہ کا موقع نہیں ملتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابتداءً صحابہ وار حدیثیں جمع ہوتی رہیں۔ صحابہ کے بعد کے دور میں ایک شخص کئی استادوں سے سے درس لیتا ہے۔ مثلاً وہ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد سے درس لینے اور ان کی روایت کردہ ساری حدیثوں کو قلم بند کرنے کے بعد ایک دوسرے صحابی کے شاگرد کے پاس جاتا ہے اور ان سے ان کی حدیثیں سنتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ دو تین نسلوں کے بعد ساری حدیثیں علماء کے علم میں آ گئیں۔ ایک اور چیز کا ذکر کرتا چلوں جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق ہے اور ان کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسے صحابی ہیں جو دیر سے مسلمان ہوئے یعنی سنہ ۷ ہجری میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تین چار سال پہلے اسلام لائے۔ اس کے باوجود ان سے بے شمار حدیثیں مروی ہیں۔ اس کی وجہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ "دیگر صحابہ مثلاً ابو بکر، عمر، عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور فلاں فلاں صحابی سارا دن اپنے کاروبار میں لگے رہتے، اپنی تجارت اور اپنی دکان میں مصروف رہتے۔ میں پیٹ بھرا بن کر مسجد نبوی کے اندر پڑا رہتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی باتوں کو سننے کا جتنا موقع مجھے ملتا، اتنا بڑے بڑے صحابہ کو بھی نہ ملتا، ان کا حافظہ بھی بڑا اچھا تھا، علمی ذوق بھی تھا، لکھنا بھی آتا تھا۔ انہوں نے بہت سی حدیثیں لکھیں۔ چنانچہ ان کے ایک شاگرد حسن بن عمرو بن امیہ ضمری نے ایک دن غالباً حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیرانہ سالی کے زمانے میں، اپنے استاد سے کہا کہ "استاد، آپ نے فلاں چیز بیان کی تھی" انہیں یاد نہیں تھا مکر گئے۔ نہیں صاحب میں نے کبھی یہ نہیں کہا ایسی کوئی حدیث مجھے بالکل یاد نہیں۔ نہیں استاد، آپ نے ہی ہم سے یہ چیز بیان کی ہے۔ اس پر ان کا بیان ہے کہ استاد نے میرا ہاتھ پکڑا، اپنے گھر کی طرف چل دیے اور راستے میں یہ کہتے چلے کہ اگر واقعی میں نے وہ حدیث تم سے بیان کی ہے تو وہ میرے پاس تحریری صورت میں موجود ہونی چاہیے۔ چنانچہ گھر لائے، اپنی الماری سے ایک جلد نکالی ورق گردانی کی مگر نہیں ملی پھر دوسری جلد اور پھر تیسری جلد میں نظر دوڑائی۔ پھر اس کے بعد یک بہ یک خوشی کی حالت میں پکار اٹھے کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ اگر میں نے بیان کیا ہے تو وہ میرے ہاں تحریری صورت میں موجود ہونا چاہیے۔ دیکھو یہ موجود ہے۔ ٹھیک ہے۔ ابن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے مزید بر آں الفاظ یہ ہیں: "اَرانا کتبا کثیرة من الحدیث" (ہمیں ابوہریرہ نے حدیث کی بہت سی کتابیں دکھائیں) یعنی میں نے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بہت سے کتابیں ان کے گھر کے کتب خانے میں دیکھیں۔ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طرز عمل عالمانہ اور بہت دلچسپ تھا۔ ان کے پاس جو شاگرد آتے، سارے شاگردوں کو وہ ایک ہی چیز نہیں پڑھاتے تھے۔ ہر شاگرد کو الگ الگ حدیثیں پڑھاتے تھے۔ چنانچہ جب ہمام بن منبہ ان کے پاس آتے ہیں تو ان کو ایک خصوصی رسالہ سو ڈیڑھ سو حدیثوں کا مرتب کر کے دیتے ہیں۔ جو "صحیفہ ہمام بن منبہ" کہلاتا ہے۔ ایک

دوسرا شاگرد آتا ہے، اس کے لیے ایک نیا مجموعہ تیار کرتے ہیں جو اس شاگرد کے نام سے منسوب ہوا۔ غرض حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ہزاروں حدیثیں انہیں حفظ تھیں اور اپنے متعدد شاگردوں کو انھوں نے جو رسالے لکھ دیے تھے وہ آج تک محفوظ چلے آ رہے ہیں۔

بعض حدیثوں میں ذکر ملتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ حدیث کو مت لکھو اور بعض حدیثوں میں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا، صراحت کے ساتھ حکم ہے کہ اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لو یعنی انہیں ضرور لکھو کیونکہ اس منہ سے کوئی چیز جھوٹی نہیں نکل سکتی۔ ان باتوں کے تضاد کو کیسے دور کریں گے؟ اس بارے میں اب ہمارے لیے کوئی دشواری باقی نہیں رہی۔ مختصر قصہ یہ ہے کہ ایسے متعدد صحابہ ملتے ہیں جن کا بیان ہے کہ حدیث کو نہیں لکھنا چاہیے۔ لیکن وہ اس امر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کرتے کہ رسول اللہ نے کہا کہ حدیث کو مت لکھو۔ جو صحابی اپنی رائے بیان کرتے ہیں اس پر ہمیں بحث کرنے کی ضرورت نہیں لیکن جو صحابہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ حکم دیا کہ نہ لکھیں، اس پر ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ان میں تین صحابی ملتے ہیں، ایک حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، خود انھوں نے حدیث کی کثیر کتابیں لکھ رکھی تھیں، دوسرے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اور تیسرے ابو سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ جہاں تک زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کا تعلق ہے ہمارے ماہرین حدیث اس کو رد کر

دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ درمیان کے راوی ثقہ نہیں ہیں۔ انہوں نے غلطی کی ہے۔ علم حدیث کے اصول کی روسے یہ حدیثیں قابل قبول نہیں ہیں۔ صرف ابو سعید الخذری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث اصول کی رو سے بہت اہم ہے کیونکہ " صحیح مسلم " جیسی حدیث کی صحیح کتاب میں یہ موجود ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے ہم سے کہا کہ مجھ سے کوئی حدیث نہ لکھو اور اگر لکھ چکے ہو تو اسے مٹا ڈالو۔ اس حدیث کی موجودگی میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کسی سیاق و سباق context میں خاص حکم سے متعلق تھا یا کوئی عام حکم تھا؟ ہمارے دوست، مصطفیٰ الاعظمی حدیث کے ایک ماہر استاد، جو آج کل ریاض یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، انہوں نے ایک دلچسپ تحقیق کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ " صحیح مسلم " میں جو حدیث آئی ہے امام بخاری رح اسے رد کر دیتے ہیں۔ امام بخاری کہتے ہیں کہ یہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ حقیقت میں یہ ابو سعید الخذری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذاتی رائے تھی جو کسی درمیانی راوی کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی طرف منسوب ہو گئی ہے۔ ان حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کا یہ حکم کہ حدیثیں نہ لکھو، اس کا اصول حدیث کی روسے کوئی ثبوت نہیں۔ اگر فرض بھی کر لیں کہ کسی وقت حضور صلی اللہ علیہ و سلم نے ممانعت فرمائی تھی تو اس کا حل آسان ہے غالباً کسی خاص سیاق و سباق context میں یہ حکم صادر ہوا تھا کہ کیونکہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مثال موجود ہے۔ وہ نہایت ہی دین دار اور حدیث پر عامل شخص تھے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے واقعی ممانعت کی ہوتی تو وہ کبھی جسارت نہ کرتے کہ حدیث کی بہت سی کتابیں خود لکھ ڈالیں۔ ممکن ہے کس وجہ سے منع کیا گیا ہو اور اس واقعہ کے مطابق اسے نہ لکھا گیا ہو۔ مثلاً ایک معین دن کی حدیثوں کو نہ لکھا اور بعد میں عام اجازت کے

تحت لکھ ڈالا۔ غرض کوئی خاص سیاق و سباق ہو گا۔ مثلاً کسی دن حضور صلی اللہ علیہ و سلم نے جیسا کہ حدیث میں اس کا ذکر آتا ہے، قیامت تک پیش آنے والے واقعات کو مسلمانوں سے بیان فرمایا کہ تم فلاں ملک فتح کرو گے، ایسے علاقوں میں جاؤ گے، ایسے ایسے امور پیش آئیں گے۔ غرض کبھی قیامت تک پیش آنے والی باتوں کو حضور صلی اللہ علیہ و سلم نے بیان فرمایا۔ اس سلسلے میں یہ بیان بھی موجود ہے کہ بعض صحابہ نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! جب یہ مقدر ہیں تو پھر ہمیں کوشش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا کوشش کرنا بھی مقدر ہے، ایسا کرنا پڑے گا۔ ممکن ہے اس دن حضورؐ نے فرمایا ہو کہ ان باتوں کو مت لکھو کیونکہ بعض صحابہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر یہ کہہ دیتے تھے کہ جب مقدر ہو چکا ہے تو کوشش کرنے کی کیا ضرورت؟ یا کوئی اور وجہ ہوئی ہو گی۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف بھی بعض کتابیں منسوب ہوئیں۔

ایک آخری نکتہ ہے جس پر میں اس تقریر کو ختم کرتا ہوں، وہ یہ کہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے مقرب ترین صحابہ نے حدیث کے متعلق کیا کام کیا؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق یہ روایت ملتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی وفات کے بعد، انہوں نے اپنی بقیہ مختصر زندگی کے دو ڈھائی سال کے عرصے میں حدیث کا ایک مجموعہ تیار کیا۔ جس میں پانچ سو حدیثیں تھیں۔ لکھنے کے بعد ان کو وہ اپنی بیٹی حضرت عائشہ

رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سپرد کرتے ہیں۔ میرا گمان یہ ہے کہ شاید بیٹی ہی نے فرمائش کی ہو کہ "ابا جان مجھے کچھ حدیثیں کتابی صورت میں لکھ دیجئے" کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو علم کا بے پناہ ذوق و شوق تھا۔ بیٹی کی تمنا پر حدیثیں مرتب کیں اور انہیں دے دیں۔ مگر اس رات کو وہ حضرت عائشہ ہی کے مکان میں لیٹے اور سو نہ سکے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ میرے ابا جان ساری رات کروٹیں بدلتے رہے، مجھے ذرا خوف ہوا کہ وہ بیمار ہیں۔ صبح کو بھی میں نے جسارت نہیں کی کہ خود پوچھوں کہ کیا آپ بیمار ہیں۔ خود ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ "بیٹی! میں نے تمہیں جو کتاب دی ہے وہ لے آنا۔ میں لائی تو اسے فوراً پانی سے دھو کر مٹا دیا اور کہا "اس میں بعض حدیثیں وہ ہیں جو میں نے خود سنی ہیں"۔ ان کے متعلق مجھے یقین ہے۔ بعض کو میں نے کسی اور صحابی سے سنا تھا۔ مجھے جھجک اور خوف ہے کہ شاید وہ الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ رسول اللہ کی طرف کوئی ایسا لفظ منسوب کروں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نہ ہو اور کسی بالمعنی روایت کے تحت آیا ہو۔ مگر اس حدیث کا یہ پہلو بہت اہم ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث لکھنے کی ممانعت کی ہوتی تو یقیناً حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس سے واقف ہوتے اور وہ لکھنے کی جسارت نہ کرتے۔ لکھنے کے بعد آپ کا مٹانا اس بناء پر نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت کی تھی بلکہ اس بناء پر تھا کہ انہیں خوف تھا کہ کہیں صحیح حدیث میں کمی بیشی نہ ہو جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق بھی ایسی ایک روایت ملتی ہے۔ایک زمانے میں انہوں نے حدیث کو مدون کرنے کی کوشش فرمائی تھی۔انہوں نے لوگوں کو جمع کر کے مشورہ کیا۔سب کا مشورہ یہی تھا کہ "لکھنا چاہیے" مگر کافی عرصہ بحث مباحثہ اور مشورہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ نہیں لکھنا چاہیے۔اور کہا کہ ہم سے پہلے کی امتوں نے انبیاء کے اقوال پر عمل کیا، ان کو محفوظ رکھا لیکن خدا کی نازل کردہ کتاب کو بھول گئے۔اس کی تحریفیں ہونے لگی۔میں نہیں چاہتا کہ قرآن کے متعلق بھی یہ سانحہ پیش آئے۔اس طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حدیث کی تدوین کا جو ارادہ فرمایا تھا، اس سے یہ یقینی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی ممانعت نہیں ہوئی ورنہ وہ لکھنے کا ارادہ نہ کرتے۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نہ لکھنے کی وجہ ایک دوسری ہی تھی کہ لوگ قرآن سے غافل نہ ہو جائیں۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانے میں ایک دن فرمایا: " جسے ایک درہم خرچ کرنے کی توفیق ہے وہ کاغذ خرید لائے، میں حدیثیں لکھواتا ہوں، لکھ لے، ان کے ساتھیوں میں سے ایک صاحب بازار جاکر ایک درہم میں کاغذ کی ایک گڈی خرید لائے۔حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بہت سی چیزیں لکھوائیں اور وہ ان کے پاس محفوظ رہیں۔اس قصے سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے حدیث لکھنے کی ممانعت نہیں کہ ورنہ حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم جیسے اصحاب کبار حدیث لکھنے یا لکھوانے کی جسارت نہیں کر سکتے تھے۔

سوالات و جوابات

سوال ۱:

مسلمانوں کی حدیث کی کتابوں میں اختلاف کیوں ہے۔ مثلاً اہل سنت کے نزدیک "صحاح ستہ" اور دوسری کتب ہیں، لیکن اہل تشیع ان سب کے منکر ہیں، اور ان کی اپنی حدیث کی کتب ہیں۔ اس اختلاف کی وجہ نیز "حق" کی وضاحت فرمائیں؟

جواب:

آپ نے بڑا مشکل سوال کیا ہے۔ اگر ایک ہی فرقے کی چیزیں ہوں تو آدمی آسانی سے جواب دے سکتا ہے۔ جب فرقہ داری مسئلہ بن جائے تو میں ہمیشہ اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں ایک فرقے سے تعلق رکھوں اور دوسرے فرقے پر اعتراض کروں خاص کر اس کی غیر موجودگی میں کہ اسے جواب کا موقع نہ ہو تو یہ علمی نقطہ نظر سے ٹھیک نہیں ہوتا۔ بہر حال جس حد تک ممکن ہے مختصر الفاظ میں آپ کو اس کا جواب

دیتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے تھوڑی دیر پہلے اشارۃً ذکر کیا، حدیثوں کو مدون کرنے اور اس کو محفوظ کر کے ایک نسل کے بعد دوسری نسل تک پہنچانے کا عمل سرکاری نگرانی میں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے زمانے میں ہوا، نہ خلفائے راشدین کے زمانے میں بلکہ پرائیوٹ طور پر مختلف افراد اپنی ذاتی ذمہ داری پر یہ کام کرتے رہے۔ پھر ایک استاد کے درس میں آنے والے بالفرض دس پندرہ شاگرد تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی صلاحیتیں یکساں نہیں ہو سکتیں۔ ایک ہی استاد کی بیان کردہ حدیث کو اس کے سامعین میں سے وہ شخص روایت کرتے ہیں اور اس انفرادی فرق کی وجہ سے اس میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ایک فطری امر ہے جس کو روکا نہیں جا سکتا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ بعض وقت لفظ بہ لفظ حدیث کی روایت کرنے کی جگہ اس کا خلاصہ یا اس کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔ ایسے نازک مقامات بھی آتے ہیں کہ لفظ کے بدلنے سے مفہوم میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک آدمی کا حافظہ اچھا ہوتا ہے، دوسرے کا حافظہ کمزور ہوتا ہے یا کسی ایک شخص کا ایک زمانے میں حافظہ ٹھیک ہے، اس کے بعد مثلاً بڑھاپے کی وجہ سے اس کا حافظہ کمزور ہو گیا ہے اور اس کے باوجود اپنے تدریسی کام کو جاری رکھتا ہے۔ انھی وجوہ سے حدیثوں میں باہم تضاد بھی نظر آ سکتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو وہی ہے کہ راوی سے غلطی ہوئی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے ابتداً ایک حکم دیا اور بعد میں اسے کسی نہ کسی وجہ سے منسوخ کر دیا اور نیا حکم دیا۔ ان حالات میں "الف" صحابی کے پاس پہلے دن کی بات تو موجود ہے لیکن دوسرے دن کی بات یا دوسری مرتبہ بیان کی ہوئی بات موجود نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی بیان کردہ حدیث اور دوسرے شخص یعنی بعد والے صحابی کی بیان کردہ حدیث میں اختلاف ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بعض وقت امت کی

صلاحیتوں کے پیش نظر یا کسی خاص سیاق و سباق میں ایک حکم دیا جاتا ہے اور بعد میں اسے بدلنا پڑتا ہے۔ اس کی ایک مثال میں عرض کر چکا ہوں یعنی کھجور کے نر اور مادہ پھولوں کو ملانے کا مسئلہ۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداً صراحت کے ساتھ اس کا حکم دیا، بعد میں صراحتاً اسے منسوخ بھی فرمایا۔

ایک اور مثال اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ قبر پرستی انسانی سوسائٹی میں ایک عام مرض رہا ہے۔ عرب میں بھی اسلام سے پہلے اس کا رواج تھا، آج بھی ہم میں پایا جاتا ہے۔ غالباً اس کو روکنے کی غرض سے (تاکہ آدمی قبر میں سونے والوں سے مانگنے کی بجائے خدا سے مانگے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت ہی کی ممانعت فرما دی۔ کچھ عرصہ بعد ان الفاظ کے ساتھ اس کی مکرر اجازت دے دی۔ "**كنت نهيتكم عن زيارة القبور الا فزوروها**" (میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا، سنو! اب تم زیارت کر سکتے ہو) اس دوسرے حکم کی وجہ یہ نہیں تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے بدل گئی بلکہ یہ کہ سیاق و سباق بدل گیا۔ قبر پرستی سے بے شک روکنا چاہتے تھے لیکن قبرستان میں جانے سے جو عبرت ہوتی ہے، یعنی ہم سوچتے ہیں کہ ہمیں بھی ایک روز مرنا ہے تو کیا ہمیں اس کے لیے تیار نہیں ہونا چاہیے؟ کیا ہمیں جھوٹ، دغا بازی اور فریب وغیرہ پر ہی قائم رہنا چاہیے؟ تو عبرت حاصل کرنے کی خاطر آپ نے اجازت دے دی۔ غرض حدیث میں اختلاف ایک طرف فرقہ وارانہ ہے اور دوسری طرف ایک فرقے کے اندر بھی ہے۔ ان دشواریوں کو دور کرنے کے لیے ماہرین علم حدیث نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اس کو انھوں نے مختلف تدبیروں کے ذریعہ سے حل کیا، مثلاً ایک خصوصیت جو مسلمانوں ہی میں پائی جاتی

ہے دوسری قوموں میں عملاً غیر موجود ہے وہ یہ کہ حوالہ نامکمل نہ ہو۔ مثلاً میں آج سے چودہ سو برس پہلے کی ایک حدیث بیان کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یوں کرو یہ نامکمل حوالہ ہوگا۔ اس کے برخلاف اگر میں بیان کروں کہ میرے استاد "الف" نے کہا کہ اسے اس کے استاد "ب" نے "ج" نے اس طرح تمام استادوں کا نسلاً بعد نسل ذکر کرتے ہوئے کہوں کہ آخری استاد فلاں صحابی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے تو وہ حوالہ مکمل ہوگا۔ چنانچہ حدیث کی کتابوں میں ہر آدھی سطر یا ایک سطر کی جو حدیث ہوتی ہے، اس کے شروع میں ایک لمبی فہرست ہوتی ہے کہ عن فلاں، عن فلاں عن فلاں۔ مثلاً بخاری جو قدیم ترین مؤلفوں میں سے ایک ہیں، ان کی حدیثیں بعض دفعہ تین درمیانی راویوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی ہیں اور زیادہ سے زیادہ نو تک۔ گویا ڈھائی تین سو سال کے عرصے میں نو پشتیں راویوں کی آ چکی تھیں۔ اس بات کی تحقیق کے لیے کہ حوالہ مکمل ہے یا نہیں، یہ ضروری ہے کہ ہمارے سامنے ایسی کتب ہوں جن میں ہر راوی کی سوانح موجود ہو۔ مثلاً یہ بیان کیا جائے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد "الف" "ب" "ج" تھے اور پھر میرے سامنے ایک روایت آتی ہے جس میں عن فلاں، عن فلاں، عن فلاں، کرتے ہوئے مثلاً "ب" یا "ج" نامی شخص بیان کرتا ہے کہ "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا" تو اس کتاب کی مدد سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ چونکہ یہ سب راوی ثقہ ہیں اور استاد شاگرد رہے ہیں، اس لیے یہ روایت قابل قبول ہے، یہ بھی کہ ہر ایک کا ذاتی کردار کیسا تھا۔ یا اس کا حافظہ اچھا تھا یا نہیں، یہ بھی کہ اس کے استاد کون کون تھے۔ اور شاگرد کون کون تھے، تاکہ اس قسم کی سوانح عمریوں کی مدد سے ہم استاد کو جانچ سکیں اور یہ معلوم کر سکیں

کہ راویوں کی تاریخ کا جو حوالہ دیا گیا ہے وہ واقعی صحیح ہے یا فرضی ہے۔ اس کے بعد علم اصول حدیث وجود میں آیا، جس میں یہ بیان کیا جانے لگا کہ اگر حدیثوں میں ایسی باتیں نظر آئیں جو خلاف عقل ہوں یا حدیثوں میں فلاں فلاں عیب یا کمی ہو، تو ایسی صورتوں میں ہم کیا کریں؟ کس طرح ان گتھیوں کو سلجھائیں! چنانچہ روایت اور درایت کے دو اصول مسلمانوں نے اختیار کیے۔ روایت کے اصول کے مطابق یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ حدیث کو بیان کرتے ہیں آیا وہ بیان کرنے والے فرضی ہیں یا حقیقی، قابل اعتماد ہیں یا جھوٹ بولنے والے ہیں۔ استاد شاگرد ہیں یا نہیں؟ یہ روایتاً حدیث کو کنڑول کرنے یا جانچنے کا طریقہ ہے۔ درایت کے اصول کے مطابق یہ دیکھا جاتا ہے کہ حدیث میں جو بات بیان کی گئ ہے وہ عقلاً درست ہے یا نہیں۔ فرض کیجئے ایک حدیث میں ذکر آتا ہے کہ مثلاً شہر بہاولپور میں فلاں چیز ہو گی۔ لیکن درایتاً اس زمانے میں شہر بہاولپور موجود تھا ہی نہیں، یہ ذکر کیسے آیا۔ لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ غالباً یہ سہو کتاب ہے، یا یہ کہ حدیث جعلی ہے اس شہر کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہاولپور بیان نہ کیا ہو گا، بلکہ اور لفظ ہو گا جو بگڑ کر بہاولپور بن گیا۔ یہ اور اس طرح کی چیزیں ہم درایت سے معلوم کر سکتے ہیں اور ان اصولوں کے مطابق ہم ان دشواریوں کو حل کر سکتے ہیں جو حدیث کے اندر نظر آتی ہیں۔ اسی طرح دو حدیثوں میں اختلاف کا مسئلہ ہوتا ہے۔ ایک میں کہا گیا ہے کہ یہ کام کرو، دوسری میں ہے کہ نہ کرو۔ تو ان دشواریوں کو جن طریقوں سے دور کیا جا سکتا ہے، وہ "علم اصول حدیث" کی کتابوں میں ملتا ہے۔ مثلاً یہ بات ممکن ہے کہ ایک حکم قدیم ہو، دوسرا حکم جدید ہو تو جدید ترین حکم قدیم حکم کو منسوخ کر دے گا۔ یا یہ کہ ایک حکم خاص ہے، دوسرا حکم عام ہے۔ ایک شخص کو یہ کہا گیا کہ یوں کرو یا یوں نہ کرو اور دوسرے لوگوں کو حکم دیا

گیا کہ تم یہ کام کر سکتے ہو۔ ایک مثال ذہن میں آتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ چند لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور ایک شکایت کی کہ مدینہ کی آب و ہوا ہمیں موافق نہیں آ رہی ہے، ہم فلاں فلاں بیماریوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا، سرکاری جانوروں کے ریوڑ میں جا کر رہو اور سرکاری اونٹوں اور اونٹنیوں کے دودھ اور ان کے پیشاب پیو۔ بظاہر یہ بات ہمیں حیران کن معلوم ہوتی ہے کہ پیشاب پینے کا حکم کیسے دیا جا سکتا ہے، جب کہ وہ نجس چیز ہے۔ اس مشکل کا حل ہمیں اصول روایت یا درایت کے ذریعے ملتا ہے اور یہ ٹیکنکل چیز بھی ہے جو میری آپ کی رائے پر مبنی نہیں، بلکہ طبیبوں اور ڈاکٹروں کی رائے پر مبنی ہو گی۔ مثلاً زہر ہمارے لیے سم قاتل ہے لیکن ایک ڈاکٹر کسی خاص بیماری میں مریض کے لیے زہر ہی تجویز کرتا ہے۔ زہر کے بغیر اس کا کوئی علاج ممکن نہیں۔ اس طرح یہ ممکن ہے کہ کوئی خاص بیماری اونٹوں کے پیشاب کے بغیر دور نہ ہو سکتی ہو۔ جب کوئی اور چارہ کار نہ ہو تو ممنوع اور مکروہ چیزیں جائز ہو جاتی ہیں۔ اونٹنیوں کے پیشاب کے متعلق بعض ہمعصر سیاح بیان کرتے ہیں کہ وہ آج بھی بعض بدوی قبائل میں کچھ مخصوص بیماریوں کے علاج کے لیے مستعمل ہے۔ غرض مختلف طریقے ہیں جن کے ذریعے ہم حدیثوں کی اندرونی دشواریوں کو دور کر سکتے ہیں اور اس سے ہمارے علماء غافل نہیں رہے۔ گزشتہ چودہ سو سال سے وہ اس پر توجہ کرتے رہے ہیں اور ہم آج ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حدیثوں کی صحت کو جانچنے کا جو وسیلہ یا طریقہ ہمارے پاس ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی اور قوم میں نہیں پایا جاتا۔ میں اپنے عیسائی بھائیوں کو ناراض کیے بغیر یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی انجیل پر اتنا اعتماد نہیں کیا جا سکتا، جتنا ہماری بخاری، مسلم اور ترمذی پر کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ انجیل کی تدوین، انجیل کا تحفظ، انجیل کا نسل بعد

نسل منتقل ہونا، اس طریقے سے عمل میں نہیں آیا جس طریقے سے حدیث کی کتابوں میں عمل ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تین سو سال بعد تک انجیلوں کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں کہ کس نے اس کو لکھا، کس نے اس کا ترجمہ کیا اور کس نے اسے نقل کیا، اصل زبان سے یونانی زبان میں کس کے حکم سے منتقل کیا گیا۔ آیا کاتبوں نے صحت کا التزام رکھا یا نہیں۔ تین سو سال بعد چار انجیلوں کا ذکر ہمیں پہلی مرتبہ ملتا ہے۔ کیا ہم ایسی بلا سند کتاب پر اعتماد کریں یا بخاری پر جو ہر دو سطری بیان کو بھی تین سے لے کر حوالوں تک بیان کرتا ہے کہ رسول للہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان کیا ہے۔ لیکن اس کا ثبوت کیا ہے کہ بخاری نے سچ بیان کیا ہو، ممکن ہے کہ انہوں نے گھڑ لیا ہو اور راویوں سے منسوب کر دیا ہو کہ مجھے "الف" نے "ب" سے اور "ب" نے "د" سے، اسی طرح رسول اللہ تک پہنچا ہو۔ اعتراض عقلاً بالکل صحیح ہے لیکن حقیقتاً بے بنیاد اعتراض ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بخاری سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جن محدثین نے حدیث کی روایت کی ہے ان کی کتابیں بھی ہمیں موجود ملتی ہیں۔ لہٰذا بخاری پر ہمیں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں نظر آتی۔ مثال کے طور پر بخاری کہتے ہیں مجھے یہ حدیث امام احمد بن حنبل رح نے بیان کی اور کہا کہ مجھے عبدالرزاق بن ہمام نے بیان کی جنہوں نے کہا کہ میرے استاد معمر نے بیان کیا تھا۔ معمر نے کہا کہ مجھے میرے استاد ہمام بن منبہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سن کر بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا ہے۔ بخاری کی کتاب ہمارے پاس موجود ہے۔ درمیانی روایتوں کا ہمارے پاس کوئی وجود نہ ہو تو ہم علمی نقطہ نظر سے فرض کر سکتے ہیں کہ شاید امام بخاری نے جھوٹ کہا ہو۔ لیکن اگر ہمیں احمد حنبل کی کتاب مل جائے جو امام بخاری کے استاد ہیں اور اس میں من و عن وہی حدیث

انہی الفاظ میں ایک شوشے کے فرق کے بغیر ملے تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ امام بخاری جھوٹے نہیں، کیونکہ احمد بن حنبل کے پاس واقعی وہی حدیث انہیں الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔ امام احمد بن حنبل پر ہم شبہ کر سکتے ہیں۔ اس وقت جب کہ ان کا بیان ہے کہ مجھے عبدالرزاق بن ہمام رح نے بیان کیا تھا اور عبدالرزاق بن ہمام کی کتاب موجود نہ ہو۔ الحمد اللہ! احمد بن حنبل کی "مسند" کی طرح عبدالرزاق بن ہمام کی "مصنف" بھی دنیا میں موجود ہے۔ اب چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ بعض حدیثوں کے متعلق تلاش کیا گیا کہ یہ کہاں ہیں، وہ بھی بالکل انہی الفاظ میں بیان کرتے ہیں جن الفاظ میں بخاری کے ہاں ہے۔ اسی طرح ان کے استاد معمر بن راشد کی کتاب "الجامع" ہمیں مل گئی ہے۔ اس کے اندر بھی وہی حدیث جو بخاری نے بیان کی تھی انہیں الفاظ میں موجود ہے۔ اسی طرح ان کے استاد ہمام بن منبہ کا "صحیفہ" بھی دستیاب ہو چکا ہے اور چھپ چکا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امام بخاری نے جو چیزیں بیان کیں وہ بالکل صحیح ہیں، کیونکہ ان کی کتابیں جو بخاری کا ماخذ ہیں دستیاب ہو چکی ہیں اور ان کے اندر وہی الفاظ موجود ہیں۔ ان حالات میں عقل کہتی ہے کہ بے وجہ شبہ کرنا نامناسب بات ہے۔ عقل کا تقاضا ہے کہ ہم یہ تسلیم کر لیں کہ امام بخاری رح کی بیان کردہ حدیث بالکل صحیح ہے۔ پھر کچھ چیزیں ایسی ملتی ہیں جن سے ایک دوسرے کی تصدیق ہوئی۔ مثلاً ایک دوسرے سلسلہ اسناد سے امام ترمذی رح نے وہی حدیث بیان کی ہے تو یہ ناممکن ہے کہ پچاس آدمی جو مختلف ادوار سے متعلق ہیں، جھوٹ پر پیشگی متفق ہو گئے ہوں۔ غرض یہ ٹیکنیکی اصول ہیں جن کا استعمال حدیث کے متعلق کیا گیا ہے اور دنیا کی کوئی کتاب حتیٰ کہ مقدس ترین کتب توریت، انجیل وغیرہ میں بھی التزام صحت کا اتنا خیال نہیں رکھا گیا جتنا حدیث کے متعلق ہمیں ملتا ہے۔ اصولاً یہ بیان صحیح ہے کہ حدیث کی کتابوں میں جو

سنیوں کی حدیثیں ہیں اور جو شیعوں کی حدیثیں ہیں، ان میں اختلاف ہو۔ لیکن عملاً ایسا نظر آتا ہے کہ مفروضہ ہی ہے۔ راویوں کا بے شک فرق ہے۔ مثلاً میں حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت پر ایک چیز بیان کرتا ہوں، وہی بات میرا شیعہ بھائی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت پر بیان کرتا ہے، تو یہ مفروضہ کہ شیعہ سنی کی ساری حدیثوں میں فرق ہے، غلط ہے۔ فرق صرف روایت کرنے والوں میں ہے، حدیث کے مندرجات میں فرق نہیں ہے۔ تضاد شاذ و نادر ہوگا۔ اب تک کوئی ایسی خاص چیز ملی بھی نہیں، جس سے یہ کہا جائے کہ شیعہ کتابوں میں الف، چیز کا حکم ہے اور سنی کتابوں میں اس کے بالکل برعکس الف، کی ممانعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اختلافی باتیں جو ہمیں نظر آسکتی ہیں ان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ سنی خاص کر حنفی، شافعی اور حنبلی نمازوں میں ہاتھوں کو سینے پر باندھتے ہیں اور ہمارے شیعہ بھائی ہاتھوں کو چھوڑ کر نماز پڑھتے ہیں۔ یہ اس لیے نہیں کہ حدیثوں میں اختلاف ہے بلکہ اس لیے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے بعض اوقات ہاتھ باندھ کر نماز پڑھی۔ بعض اوقات ہاتھ چھوڑ کر پڑھی۔ یہ بات آسانی سے سمجھ میں آتی ہے مثلاً فرض کیجئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم ایک جنگ میں زخمی ہو گئے اور ہاتھ باندھ نہیں سکتے تھے، کیا کریں، ہاتھ چھوڑ کر ہی پڑھیں گے۔ ایک شخص نے دیکھا کہ رسول اللہ ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھ رہے ہیں۔ پھر اسے موقع نہیں ملا کہ کچھ عرصہ بعد دیکھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم دوبارہ ہاتھ باندھ کر نماز پڑھ رہے ہیں تو وہ اسی سنت پر عمل کرے گا جس کو وہ دیکھ چکا ہے۔ یہ چیز ایک پہلو سے ہمارے لیے اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ میرے استاد نے آج سے کوئی ساٹھ پینسٹھ سال پہلے پرائمری اسکول میں یہ نکتہ بیان کیا تھا، جسے میں کبھی بھول نہیں سکتا کہ اللہ کو اپنے حبیبؐ سے جو محبت تھی، اس کی خاطر اللہ نے

چاہا کہ اپنے حبیبؐ کی ہر ہر حرکت کو قیامت تک محفوظ رکھے، لہٰذا چند لوگوں کے ذریعہ سے مثلاً شیعہ فرقے کے ذریعے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حرکت محفوظ کر لی گئی۔ کہ ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری حرکت ایک دوسرے گروہ کے ذریعے سے اللہ نے قیامت تک کے لیے محفوظ رکھی۔ اس طرح جو اختلاف عمل میں نظر آتا ہے وہ حدیث کی غلطی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو مختلف زمانوں کے عملوں اور حرکتوں پر مبنی ہے۔ اس لیے ہمیں باہم ایک دوسرے کا متحمل ہونا چاہیے۔ حدیث کے اختلاف پر جھگڑنے کی جگہ یہ فرض کرنا چاہیے کہ اس خاص صورتحال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا تھا۔ دوسری صورتحال (context) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرا حکم دیا۔ ایک دوسری مثال لیجئے، جس کا آج کل اخباروں میں بھی ذکر آتا ہے یعنی "چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹنا" سنیوں کے ہاں پہنچے سے ہاتھ کاٹنے کا ذکر ملتا ہے اور شیعوں کے ہاں ہاتھ کی صرف انگلیاں کاٹنے کا ذکر ملتا ہے۔ مگر یہ خیال نہ کیجئے کہ حدیثوں میں اختلاف ہے، بلکہ سنیوں کے ہاں کی حدیثوں میں بھی اس کا ذکر آیا ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف انگلیوں کو کٹوایا تھا۔ تو ان حالات میں بجائے اس کے کہ اسے فرقہ واری اختلاف قرار دیں ہم ایک دوسرے کا تحمل کریں اور حدیث پر اپنے فرقے کے بیان کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کریں، جو ہماری نجات کے لیے کافی ہے۔ یہ نہیں کہ ان اختلافات کو دور کرنے کی لاحاصل کوشش کریں جو کبھی دور نہیں ہو سکتے۔

سوال ۲:

یہ سوال مکرر ہے کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھی؟ حدیث سے ثابت کریں؟

جواب:

امام مالکؒ کی کتابیں آپ پڑھیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ وہ اس کا ذکر کرتے ہیں اور وہ حدیث کی بناء پر کرتے ہیں۔ جب کہ امام مالکؒ خود سنیوں ہی کے ایک امام ہیں اور مالکی مذہب کے بانی ہیں۔ یہ لوگ بھی ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے ہیں۔

سوال ۳:

جو حدیثوں کا رجسٹر حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تیار کیا تھا وہ کب تک موجود رہا اور کب ضائع ہوا؟

جواب:

مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔ صرف یہ حدیث بیان ہوئی ہے کہ انہوں نے ایک مجموعہ تیار کیا تھا اور اسے اپنے شاگردوں تک پہنچایا تھا اور وہ کب ضائع ہوا، اس کا مجھے علم نہیں۔

سوال ۴:

کیا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے جب کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ میں حدیثیں کافی بیان کرتا ہوں مگر عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجھ سے زیادہ جانتے تھے کیونکہ وہ لکھتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا۔

جواب:

اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ صرف عربی لکھنا جانتے تھے بلکہ وہ حبشی زبان بھی جانتے تھے، فارسی زبان بھی جانتے تھے، کئی زبانیں جانتے تھے۔ گویا بہت عالم شخص تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پہلے لکھنا شروع کیا، ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بعد میں اس کا خیال آیا۔ ظاہر ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس حدیثوں کا زیادہ ذخیرہ تحریری صورت میں جمع ہو گیا اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ان حدیثوں کو جانتے تھے لیکن تحریری صورت میں نہیں تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکی مسلمان ہوئے ہیں۔ لازمی بات ہے کہ وہ شخص جو شروع سے لکھتا رہا ہو اس کے پاس حدیثیں زیادہ ہوں گی اور وہ شخص جسے لکھنے سے تو خوب واقفیت ہے لیکن دیر سے حدیثیں لکھنے کا موقع ملا، اس کے پاس حدیثیں کم ہوں گی۔ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں۔

سوال ۵:

آپ نے ابھی اپنے خطبہ میں فرمایا کہ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کے سوال کے جواب میں فرمایا، خدا کی قسم! جو کچھ میری زبان سے نکلتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، اللہ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں بولتے جب کہ بعض علماء کے نزدیک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ یعنی ان کی ہر بات درست نہیں، وضاحت فرمائیں؟

جواب:

میں واضح کر چکا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی والہام سے کوئی چیز معلوم ہو چکی ہو اور وہ بیان کریں گے تو وحی پر مبنی ہو گی۔ لیکن وحی ابھی آئی نہیں ہے، وحی کے انتظار میں ہیں، فوری معاملہ درپیش ہے تو اجتہاد کریں گے۔ یعنی اپنی رائے سے کوئی حکم دیں گے اور اس کے متعلق وہ حدیث ملتی ہے کہ اگر مجھے وحی آ چکی ہوتی تو میں تم لوگوں سے مشورہ نہ کرتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض وقت وحی کا انتظار رہتا تھا اور فوری ضرورتوں سے وہ خود اجتہاد کر کے اپنے فہم وفراست سے احکام دیا کرتے تھے اور ان احکام میں بعض وقت وحی کے ذریعہ سے تنسیخ بھی ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں یہ مثال ملاحظہ ہو کہ جنگ کے قیدیوں سے کیا برتاؤ کیا جائے؟ جنگ بدر کے موقع پر یہ معاملہ پیش آیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی وحی کی غیر موجودگی میں اور انتظار میں صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مشورہ دیا کہ ان سب کا سر قلم کر دیا جائے، یہ کبھی مسلمان نہیں ہوں گے۔ اسلام کے ازلی وابدی دشمن ہیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا نہیں، آج وہ مسلمان نہ ہوں لیکن ممکن ہے ان کے بچوں

میں سے کوئی مسلمان ہو جائے۔ میری رائے میں ان کو قتل نہیں کرنا چاہیے۔ ہماری دوسری ضرورتیں ہیں، انہیں فدیہ لیکر رہا کر دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشورے کو قبول کیا اور وہی حکم دیا کہ انہیں قتل نہ کیا جائے بلکہ فدیہ لیا جائے۔ اللہ کو یہ بات پسند نہ آئی۔ فرمایا "لو لا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم" (اگر پہلے ہی سے اللہ اس کا فیصلہ نہ کر چکا ہوتا (کہ اس پرانے قانون کو بدلا جائے) تو تم جو فدیہ لے رہے ہو اس پر تم لوگوں کو سخت سزا دی جاتی) آپ دیکھ رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی کی غیر موجودگی میں بعض اوقات انسانی ضرورتوں سے اور انسانی طریقہ سے مشورے کے ساتھ یا بغیر مشورے کے اپنی صوابدید کی بناء پر احکام دیا کرتے تھے اور بعض وقت وہ اللہ کو پسند نہیں آتا تھا۔ اس وقت فوراً تنسیخ کی وحی آ جاتی تھی تاکہ امت غلط چیزوں پر عمل نہ کرے۔ اس واقعے کی تھوڑی سی توجیہ میں اور کروں گا۔ قرآن مجید میں ایسی آیتیں ہیں جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ پرانے انبیاءؑ کی شریعت پر عمل کرو۔ توریت میں حکم دیا گیا ہے کہ دشمن سے لیے ہوئے مال غنیمت کو جلا ڈالو۔ وہ خدا کا مال ہے، خدا تک پہنچانے کے لیے تم اس کو جلا ڈالو۔ تم اس سے استفادہ نہ کرو۔ جب کوئی نئی وحی نہیں آتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ تھا کہ اس پرانے خدائی قانون یعنی توریت پر عمل کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مصلحت سے اس پر عمل نہیں فرمایا، اس سے خدا نے وہ آیت نازل کی "لو لا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم" (اگر پہلے ہی سے اللہ اس کا فیصلہ نہ کر چکا ہوتا (کہ اس پرانے قانون کو بدلا جائے) تو تم جو فدیہ لے رہے ہو اس پر تم لوگوں کو سخت سزا دی جاتی) بہر حال ان دونوں میں

کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس حدیث کو کہ میری زبان سے میرے منہ سے جو بات نکلتی ہے وہ برحق ہوتی ہے، اس معنی میں لیں کہ اولاً یا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے ذریعے معلوم کردہ چیزوں کو بیان کرتے ہیں۔ یا بشری حیثیت سے بھی بیان کرتے ہیں، عمداً کسی کو بھٹکانے یا گمراہ کرنے کے لیے نہیں بلکہ جو چیز مناسب ترین ہے اور جس کی خدا نے ممانعت نہیں کی ہے اس کا حکم دیتے ہیں۔ ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں رہتا۔ ضمنی طور پر ایک سوال ہے کہ ہم حدیث کے صحیح ہونے کا اندازہ کس طرح لگائیں؟ اس کا جواب میں دے چکا ہوں کہ علمائے حدیث نے مختلف علوم اختراع کیے ہیں جن سے حدیث کی روایۃً اور درایۃً دونوں طرح سے جانچ ہو سکتی ہے اور ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ کس حدیث پر اعتماد کیا جائے اور کس حدیث پر اعتماد نہ کیا جائے۔

سوال ۷:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس صحابی کو "**استعن بیمینک**" کے الفاظ فرمائے تھے ان صحابی کا اسم گرامی کیا ہے؟

جواب:

میں بیان کر چکا ہوں کہ صحابی کا نام حدیث میں مذکور نہیں۔ ایک صحابی آئے، انہوں نے کہا میں بھول جایا کرتا ہوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا "**استعن بیمینک**" چونکہ ماخذ میں نام درج

نہیں، اس لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں آپ کو نام بتا سکوں البتہ ابو رافع کے متعلق بھی ذکر آیا ہے اور میں عرض کر چکا ہوں کہ وہ ایک آزاد شدہ غلام تھے انہیں بھی یہ دقت پیش آتی تھی کہ وہ بھول جاتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، کیا میں آپ کی بیان کردہ چیزوں کو لکھ سکتا ہوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لو۔ یعنی لکھ لیا کرو۔

سوال ۸:

جو حضرات غلط قسم کا پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ احادیث کو تین سو سال بعد مدون کیا گیا وہ کیا دلیل پیش کرتے ہیں؟

جواب:

وہ دلیل یہ ہے کہ ان کے نزدیک اولاً صحیح بخاری جو تیسری صدی کی تالیف ہے وہ حدیث کی قدیم ترین کتاب ہے لیکن بخاری سے لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جو دور گزرے ہیں اور امام بخاری رح کے استاد اور استاد کے استاد، انہوں نے حدیث کو تحریری صورت کبھی نہ دی۔ لیکن اب ان سب کی کتابیں بڑی حد تک دستیاب ہو چکی ہیں۔ اس لیے وہ پرانا اعتراض جو گولڈ سہیر Goldzeir نے کیا تھا باقی نہیں رہتا۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹا سا لطیفہ میں آپ سے بیان کرتا ہوں۔ کوئی چار پانچ سال کا عرصہ ہوا، میں نے جرمن زبان میں ایک مضمون لکھا تھا جو جرمنی کے ایک رسالے میں شائع ہوا۔ اس میں یہی بات بیان کی گئی تھی کہ

حدیث کے متعلق یہ تصور کہ وہ تین سو سال بعد مدون ہونا شروع ہوئی، فلاں فلاں اسباب سے صحیح نہیں۔ مضمون چھپنے کے کوئی چھ آٹھ مہینے کے بعد ایک جرمن پروفیسر نے اس موضوع پر ایک نیا مضمون لکھا، اور وہی پرانی دلیلیں اس میں دہرائیں کہ حدیث ناقابل اعتماد ہے، وہ تین سو سال بعد جمع ہونی شروع ہوئی۔ میرا اصول رہا ہے کہ کسی پر اعتراض نہ کروں، واقعات کو اس طرح پیش کروں کہ لوگ اپنے ممکنہ اعتراض کا جواب خود ہی پالیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب یہ دوسرا مضمون چھپنے کے لیے آیا، اسے بھی شائع کر دیا گیا ایڈیٹر نے فٹ نوٹ دیا کہ صاحب مضمون کو چاہیے کہ فلاں نمبر میں شائع شدہ، حمید اللہ کے مضمون کو پڑھ لے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کون سا اصول بہتر ہے۔

سوال۹:

امام مہدیؒ کے بارے میں متعارض احادیث کا کیا حل ہے؟

جواب:

مجھے کوئی علم نہیں کہ کیا متعارض حدیثیں ہیں۔ حدیث کی کتابوں میں ذکر آیا ہے کہ آخری زمانے میں میری امت سے ایک شخص پیدا ہوگا، جس کا نام میرے ہی نام کے مطابق ہوگا، یعنی "محمد" اس کے باپ کا نام میرے باپ ہی کے نام کے مطابق ہوگا یعنی "عبداللہ" اس کی ماں کا نام میری ہی ماں کے نام کے مطابق ہوگا یعنی "آمنہ" اور وہ یہ یہ کام کرے گا۔ میرے علم میں ایسی کوئی حدیثیں نہیں ہیں کہ انہیں متعارض کہا

جائے۔ البتہ حدیث میں کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ فلاں سال پیدا ہوں گے، کب ہوں گے؟ ہمیں کوئی پتہ نہیں۔ جب بھی آئیں گے اس کے لیے ہمیں تیار رہنا چاہیے تاکہ امام مہدیؒ کے اچھے رفیق بننے کا شرف حاصل ہو سکے۔

سوال۱۰:

حدیث قدسی چونکہ خدائے پاک کے الفاظ ہیں تو حدیث قدسی کو قرآن پاک میں کیوں نہیں شامل کیا گیا؟ وضاحت کریں۔

جواب:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مناسب نہیں سمجھا، یہی اصل جواب ہے کیونکہ ضرورت نہیں تھی کہ قرآن مجید کو ایک لا محدود کتاب بنایا جائے۔ بہتر یہی ہے کہ قرآن مجید مختصر ہو۔ ساری ضرورت کی چیزیں اس کے اندر ہوں اور وقتاً فوقتاً اس پر زور دینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیگر چیزیں بیان کریں جو حدیث میں بھی آئی ہیں اور حدیث قدسی میں بھی۔ اس سے ہم استفادہ کر سکتے ہیں لیکن اس کو قرآن میں شامل کرنے کی ضرورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس نہیں فرمائی۔ حدیث قدسی کی جو کتابیں ہیں ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو قرآن پر اضافہ سمجھی جا سکتی ہے، بلکہ قرآن ہی کی بعض باتوں کو دوسرے الفاظ میں زور دے کر بیان کیا گیا ہے۔

سوال ۱۱:

آپ نے تقریر میں فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں انشورنس کا نظام رائج تھا۔ ذرا وضاحت فرمائیں کہ کیا موجودہ انشورنس کے نظام میں اور اس انشورنس میں کیا فرق ہے؟ کیونکہ موجودہ انشورنس کے نظام کو غیر شرعی کہا جاتا ہے۔

جواب:

زمانہ حال میں دو طرح کے بیمے یا انشورنس ہے ایک سرمایہ دارانہ Capitalist انشورنس اور دوسرے کو تعاونی Mutualist انشورنس کہتے ہیں۔ Capitalist میں سرمایہ دار انشورنس کمپنیاں قائم کرتے ہیں اور Clients سے اتنی رقم لیتے ہیں جو انشورنس کے متوقع ہرجانوں سے کچھ زیادہ ہو۔ گویا پوری منفعت سرمایہ دار لے لیتے ہیں۔ Mutualist سسٹم میں Clients منفعت میں شریک ہوتے ہیں۔ مثلاً موٹر کار کی انشورنس کمپنی کو لیجئے۔ پانچ سو آدمی اس کے ممبر بنتے ہیں اور ہر شخص ہر سال ایک سو روپیہ ادا کرتا ہے۔ اگر کمپنی کو پہلے سال پچاس ہزار روپے کی آمدنی ہوئی جب کہ ایک ممبر کے حادثے کا معاوضہ دو ہزار روپے دینا پڑا۔ اس کے علاوہ دس ہزار روپے ملازمین کو تنخواہوں کے لیے دینے پڑے اور باقی رقم محفوظ رہی۔ دوسرے سال پرانے ممبروں سے سو روپے کی جگہ کچھ کم رقم لی جاتی ہے۔ Capitalist انشورنس میں پوری منفعت سرمایہ دار لیتے ہیں۔ Mutualist سسٹم میں Clients کو استفادے کا موقع ملتا ہے۔

عہد نبوی میں جو انشورنس کا نظام تھا وہ Mutualist سے کچھ قریبی مشابہت رکھتا ہے۔ وہ حقیقت میں ایک دوسرے کے تعاون اور امداد باہمی کے اصول پر مبنی تھا۔ یعنی ایک قبیلہ کے جملہ افراد اپنے قبیلے کی انجمن کے خزانے کو سالانہ تھوڑی تھوڑی رقم دیتے ہیں۔ مثلاً ہر شخص ایک درہم، دو درہم دیتا ہے اور جب کبھی کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو کمیٹی کا یہ سرمایہ جو سارے افراد قبیلہ کی طرف سے آیا تھا، اس شخص کی ضرورت کے لیے کام آتا تھا جسے ہرجانہ ادا کرنا ہے پھر اس میں Mutualist سسٹم کو بڑھا کر یہ نظام قائم کیا گیا تھا کہ اگر ایک قبیلہ کے خزانے میں رقم کافی نہ ہو تو اس کے ہمسائے میں جو کمیٹی ہے وہ بھی اس کی مدد کرے اور بالآخر حکومت مدد کرے۔ یہ دو مختلف سسٹم رہے ہیں ظاہر ہے کہ اس ٹیکنکل چیز کو میں چند الفاظ میں پوری طرح واضح نہیں کر سکتا۔

سوال ۱۲:

کیا غلطی تسلیم کرنے کے بعد احادیث کی روشنی میں انتقام، سزا، جرمانہ، ضروری ہے یا معاف کر دینا اسلام کے اصولوں کے منافی ہے؟ جواب ضرور دیں التجا ہے۔

جواب:

مجھے اعتراف ہے کہ میں آپ کا مفہوم پوری طرح نہیں سمجھ سکا۔ یہاں لفظ " غلطی " سے جرم مراد لیتا ہوں۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ بعض جرم ایسے ہیں جن کے لیے شریعت نے سزا مقرر کر دی ہے، اسے حد کہا جاتا

ہے، مثلاً چوری، مئے نوشی اور قتل وغیرہ۔ یہ سات آٹھ جرائم ہیں جن کے لیے حد مقرر ہے۔ ان پر معافی مانگنے کے باوجود سزا معاف نہیں ہوتی۔ مثلاً کوئی چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، چاہے وہ معافی مانگ لیے۔ قتل کے سلسلے میں قاضی سزائے موت تو دے گا لیکن سزائے موت کا نفاذ مقتول کے قریبی رشتہ داروں کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ خون کی جگہ خون بہا لیکر اس ملزم کو چھوڑ دیں۔ یہ ساری تفصیلیں حدیث اور فقہ کی کتابوں میں ملتی ہیں۔

سوال ۱۳:

قرآن نظم اور معنی دونوں کا مجموعہ ہے، جب کہ حدیث صرف قول رسول، فعل رسول، تقریر رسول کا نام ہے، اگرچہ قول رسول کا ترجمہ کسی اور نے کیا ہو۔ تو حدیث کے قرآن سے برابر ہونے کے کیا معنی ہیں؟

جواب: پہلے میں کافی وضاحت سے بیان کرنے کی کوشش کر چکا ہوں۔ اس کو مختصراً پھر دہراتا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ایک شخص یہ کہے کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ قرآن ہے، اس پر عمل کرتا ہوں لیکن اپنے آپ کو حدیثوں کا پابند نہیں کرتا۔ تو ایسے شخص کو مسلمان قرار نہیں دیا جا سکتا اسے امت سے خارج کر دیا جائے گا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد چونکہ حدیث کے ثابت کرنے کا وہ وسیلہ نہیں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں روبرو ہو کر، شخصی طور پر سننے میں ہوتا تھا۔ حدیث کی تدوین، تحفظ اور نقل ایک نسل کے بعد دوسری نسل میں جانا، اس احتیاط سے

نہیں ہو سکتا جو قرآن کے متعلق ہوئی ہے، تو اب ہم قرآن اور حدیث میں فرق کرنے پر مجبور ہیں، لیکن اصولاً دونوں یکساں ہیں کیونکہ قرآن خود کہتا ہے "من يطع الرسول افقد اطا ع الله" ان حالات میں میری دانست میں دونوں یکساں ہیں لیکن ثبوت اور شہادت کی ضرورتوں کے تحت ہم ان میں فرق کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کے حضور میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا۔

سوال ۱۴:

اولیاء اللہ کی قبروں پر جا کر السلام علیکم یا اھل القبور کہنا، فاتحہ پڑھنا اور ان کے طفیل سے خدا سے فضل و کرم کی التجا کرنا یہ امور قبر پرستی میں شامل ہیں یا نہیں؟

جواب:

میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم مزارات کی زیارت فرماتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم السلام علیکم یا اھل القبور کہا کرتے تھے، ان کے لیے فاتحہ پڑھتے تھے تو میں اگر کروں تو سنت ہی کی پیروی ہوگی، بدعت اور جدید چیز نہ ہوگی۔ باقی کسی کے طفیل سے اللہ کے فضل و کرم کی التجا کرنا، یہ نیت پر منحصر ہے۔ اگر آپ یہ خیال ظاہر کریں کہ چونکہ میں اس صاحب قبر کو

رشوت دے چکا ہوں، اس پر پھول چڑھا چکا ہوں، لہٰذا ان کا فریضہ ہے کہ جو چیز اللہ میاں نہیں چاہتے وہ کر ڈالیں، یہ چیز شرک ہو گی۔

سوال ۱۵:

یتیم بچے کو اس کے دادا کی وراثت سے کیوں محروم کیا گیا۔ وراثت سے محرومی کے پس پشت جو مصلحت کار فرما ہے اس پر روشنی ڈالیے؟

جواب:

قانون کا ایک اصول ہوتا ہے اور اس اصول سے بعض وقت اتفاقاً کسی فرد کو نقصان پہنچ سکتا ہے، تو ایک فرد کے نقصان کی خاطر عام اصول کو بدلا نہیں جا سکتا۔ عام اصول یہی ہے کہ ایک شخص کی وفات پر اس کے فلاں فلاں رشتہ داروں کو ایک حصہ وراثت میں دیا جاتا ہے جو قرآن نے مقرر کر دیا ہے۔ اگر اتفاقاً اس قانون کی وجہ سے کسی ایک فرد کو نقصان پہنچتا ہے تو اس کا حل بھی قرآن و حدیث میں بیان کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ وصیت کا ایک قانون اسلام میں پایا جاتا ہے کہ جس شخص کو وراثت میں سے حصہ نہیں ملتا تو اسے مرنے والا شخص وصیت کے ذریعے سے کوئی چیز دے دے۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ کسی شخص کے مرنے پر اس کے بیٹے کو حصہ ملے اور پوتے اپنے دور میں حصہ پائیں گے۔ ان کو اس مرنے والے شخص سے یعنی دادا سے حصہ لینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ایک خاص صورت میں جب اس پوتے کا باپ مر چکا ہے، دادا کے

لیے ممکن ہے کہ اپنے مال کا ایک حصہ، وصیت کے ذریعے سے، اس پوتے کو دے دے تاکہ اسلامی قانون کے عام قاعدے کو بدلنے کی ضرورت پیش نہ آئے اور اس انفرادی دشواری، پیچیدگی اور مصیبت کو، جو پوتے کو پیش آنے والی ہے اسے بھی دور کیا جائے۔ یہ ہے فلسفہ اسلامی قانون کا کہ قانون، قانون ہی رہے اور جو استثنائی صورتیں پیش آئیں، ان کا بھی استثنائی حل پیش کیا جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ